# بال ایک چڑیل کے

## جرائم اور سراغرسانی کی حیران کُن روئیداد

احمد یار خان



# فہرست

# پیش لفظ

آپ نے احمد یار خان کی پہلی تصنیف "کار، شلوار اور دوپٹہ" پڑھ لی ہو گی جس میں پانچ کہانیاں ہیں۔ ہم ان کی چار اور کہانیوں کا مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ ان میں بھی آپ کو وہی خوبیاں نظر آئیں گی جو پہلی کہانیوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ یہ بظاہر جرم اور سراغرسانی کی وارداتیں ہیں لیکن یہ ہمارے معاشرے کے اور چار دیواری کی دنیا کے ڈھکے چھپے گوشوں کے وہ ڈرامے ہیں جو پڑھو تو ہمیں چونکا دیتے ہیں مگر عملی زندگی میں جب یہ ہمارے سامنے کھیلے جاتے ہیں تو ہم چونکنے کی بجائے ان سے نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔ ہم اپنے گناہوں کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور انہیں کسی اور کے گناہ سمجھ کر ان کے تذکرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کہانیاں آپ کی آنکھیں کھول دیں گی۔

"جرم و جاسوسی" ایک رسوا موضوع ہے کیونکہ اس موضوع کی کہانیوں میں جُرم کی ترغیب اور فحاشی کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر آپ کے بچے ان کہانیوں کے عادی ہو گئے ہیں تو انہیں احمد یار خان کی یہ دو کتابیں پڑھائیں۔ ماہنامہ "حکایت" میں اسی مصنف کی کہانیاں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔ ان سے آپ کے بچوں کا نشہ بھی پورا ہو جائے گا اور وہ نہ صرف فحاشی سے بچیں گے بلکہ ان کے کردار کی بہتر نشوونما ہو گی۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

# میں آج بھی حیران ہوں

اُس نے رشید کی جگہ خود پھانسی کے تختے پر کھڑا ہونے کے لئے ہر وہ ثبوت اور شہادت مہیّا کی جو استغاثہ کو قابلِ اعتبار بنانے کے لئے درکار تھی۔ وہ باپ تھا۔ اپنی بچّی پر قربان ہوگیا۔

بعض واقعات ایسے حیران کُن ہوتے ہیں کہ سچے ہونے کے باوجود جھوٹے لگتے ہیں۔ پولیس والوں کے سامنے ایسے واقعات زیادہ آتے ہیں جو عام شہریوں کے لیے ناقابلِ یقین حد تک حیران کُن ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ جو مَیں آپ کو سنانے لگا ہوں، ایسے ہی واقعات میں سے ایک ہے۔ یہ قارئین کے لیے شاید ناقابلِ یقین ہو لیکن مجھ جیسے آدمی کے لیے جس نے پولیس سروس میں پچیس سال قتل، ڈاکے اور بے شمار جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں لوگوں کے گھروں کے اندر کے اور دلوں کے اندر کے بھید بہت قریب سے دیکھے ہوں، یہ واقعہ ناقابلِ یقین یا حیران کُن نہیں البتہ غیر معمولی ضرور ہے۔ یہ جذبات اور جذبۂ ایثار کی ایک غیر معمولی مثال ہے اور یہ میرا ایک ایسا کیس ہے جس کی میں نے تفتیش مکمل کر دی تھی، قاتل کو پھانسی دے دی گئی تھی، لیکن بیس سال بعد پتہ چلا کہ میری تفتیش مکمل نہیں تھی۔

۱۹۶۲ء کا ذکر ہے۔ پاکستان کے ایک شہر میں ایک آدمی کو دیکھا۔ شک ہُوا کہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتا رہا۔ قریب آ کر ہم دونوں رُک گئے۔ اُس نے ہاتھ آگے کیا اور مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔

"کہاں ہیں آپ؟"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔ پچیس سال کی سروس میں لاکھوں انسانوں سے پالا پڑا تھا۔ ان میں ملزم، مشتبہ، گواہ اور عدالتوں کے اہل کار تھے۔ کسے کسے یاد رکھا جا سکتا ہے۔

اس نے پوچھا۔ "اب تو آپ ڈی۔ ایس۔ پی یا ایس۔ پی ہوں گے!"

میں نے اسے بتایا کہ پاکستان بنا تو دو اڑھائی سال بعد پنشن مل گئی تھی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "آپ کا چہرہ جانا پہچانا ہے، یاد نہیں رہا کہاں دیکھا تھا۔"

"آپ انڈیا میں ایس۔ ایچ۔ او۔ تھے" ۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔ "مجھے آپ نے کالج کے ایک لڑکے کے قتل کے سلسلے میں حراست میں لیا تھا۔"

"اوہ! یاد آیا۔" میں نے کہا ۔۔۔ "پھر اصل قاتل خود ہی تھانے میں آ گیا تھا اور میں نے آپ کو تفتیش سے خارج کر دیا تھا۔" مجھے بیس سال پہلے کا یہ قتل یاد آ گیا۔

"ہماری دوسری ملاقات ۱۹۴۶ء میں دلی میں قائداعظمؒ کے جلسے میں ہوئی تھی۔" اس نے کہا ۔۔۔ "وہ مسلم لیگ کا تاریخی جلسہ تھا۔" پھر اس نے اپنا نام بتایا ۔۔۔ "میرا نام رشید ہے۔"

مجھے یہ ملاقات بھی یاد آ گئی۔ میں اس عظیم جلسے میں سی آئی ڈی انسپکٹر کی حیثیت سے گیا تھا اور رشید مسلم لیگ کا ورکر تھا ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے بیس سال پرانا قتل کا وہ کیس یاد آ گیا جس میں میں نے رشید کو مشتبہ سمجھ کر حراست میں لیا تھا۔ گرفتار نہیں کیا تھا۔

کیس یہ تھا کہ ۱۹۴۲ء کی ایک رات نو بجے کے لگ بھگ میں اپنے پولیس سٹیشن سے ملحق کوارٹر میں کھانا کھا رہا تھا۔ میں ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ ایک کانسٹیبل نے آ کر بتایا کہ قتل کی ایک رپورٹ آئی ہے۔ لاش فلاں ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں پڑی ہے۔

میں دفتر میں گیا۔ ہوٹل کا مالک رپورٹ دینے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ہوٹل کی دوسری منزل پر رہائش کے گیارہ کمرے ہیں۔ تقریباً سوا آٹھ بجے ایک بیرا ایک کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اسے کمرے کے اندر سے چیخ سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کی نظر فرش پر پڑی جہاں اس کمرے میں رہنے والے تھرڈ ایئر کا ایک سٹوڈنٹ فرش پر تڑپ رہا تھا اور اس کا خون بہہ رہا تھا۔ اسی کی عمر کا ایک لڑکا جو اس کے پاس کھڑا تھا، بیرے کو دیکھ کر اتنا تیز دروازے کی طرف دوڑا کہ بیرے کو اس کا دھکا لگا۔ بیرا گرتے گرتے بچا اور وہ لڑکا بھاگ گیا۔ بیرے نے اس کا پیچھا کرنے کی بجائے ہوٹل کے منیجر کو جا بتایا۔ منیجر نے مالک کو بتایا۔ سب کمرے میں گئے تو لڑکا مر چکا تھا۔

میں نے دو کانسٹیبل ساتھ لیے اور ہوٹل میں پہنچا۔ وہاں سب سے پہلی خرابی یہ دیکھی کہ ہوٹل کے باہر اتنے لوگ جمع تھے کہ ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے کھانے کے ہال میں تماشائیوں کا ہجوم تھا اور جب میں اوپر گیا تو رہائشی کمروں کے سامنے لوگ سر کے بالوں کی طرح جمع تھے۔ میں نے اور کانسٹیبلوں نے بڑی ہی مشکل سے لوگوں کو ہٹایا۔ وہاں تو آنسو گیس پھینکنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چند آدمی کمرے کے اندر بھی چلے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پاؤں اور انگلیوں کے نشان ملنے کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔ یہ نشان قتل کی ایسی واردات کی تفتیش میں مدد دیتے ہیں جس کا مجرم کوئی اور سراغ چھوڑے بغیر بھاگ گیا ہو۔ لوگوں کو برآمدے میں سے ہٹایا۔ جب ہجوم چلا گیا تو کمرے اور برآمدے میں خون ہی خون تھا جو تماشائی اپنی جوتیوں کے ساتھ کمرے سے باہر لے آئے تھے۔

## قتل کا باعث ایک لڑکی

مقتول فرش پر پڑا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر کا خوبرو مسلمان نوجوان تھا۔ لاش فرش

پر پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ قمیص ہٹا کر دیکھا۔ دل کے مقام پر چاقو کا زخم تھا۔ چاقو اس کے قریب پڑا تھا۔ خون بہہ کر دروازے سے بھی باہر چلا گیا تھا۔ فرش پر ٹوٹی ہوئی ایک چائے دانی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور ایک ٹوٹی ہوئی پیالی کے دو ٹکڑے ذرا دور پڑے تھے۔ کمرے میں میں نے ہر چیز کو غور سے دیکھا۔ میز کی دراز میں مقتول کی گھڑی رکھی تھی۔ ایک نوٹ پانچ روپے کا اور تین ایک ایک روپے کے سکے پڑے تھے۔ ٹرنک کا تالا بند تھا۔

میرے سامنے یہ سوال آیا، کیا یہ قتل ڈکیتی کے لیے کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے کالج کے دو طالب علموں سے جلدی مل گیا جو ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ وہ خود ہی آ گئے۔ کمرے کے دروازے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں وہاں سے چلے جانے کو کہا تو ایک نے کہا ــــ "ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ قاتل شاید وہی لڑکا تھا جسے ہم نے قتل سے پہلے کھانے کے ہال سے گزر کر بالائی منزل پر جاتے دیکھا تھا۔"

رہائشی کمروں میں جانے کا ایک راستہ ہال میں سے تھا۔ سیڑھیاں ہال سے اُوپر جاتی تھیں اور دوسرا راستہ جو مجھے دکھایا گیا وہ پچھواڑے سے تھا۔ وہ بھی سیڑھیاں تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ جگہ کھلی تھی اور ذرا پرے ہوٹل کے ملازموں وغیرہ کے تین چار کمرے تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ مقتول ان کا کلاس فیلو تھا۔ تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ اس کالج کے ایک لڑکے کے ساتھ مقتول کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑکے کا نام رشید ہے اور وہ ہوسٹل میں رہتا ہے۔ ہمارے کالج سے تھوڑی دور لڑکیوں کا کالج ہے۔ لڑکے اپنے کالج سے نکل کر لڑکیوں کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ مقتول، رفعت نام کی ایک طالبہ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس لڑکی کا دوستانہ رشید کے ساتھ ہے۔ انہیں اکثر اکٹھے دیکھا گیا ہے۔ مقتول کا خیال تھا کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں۔ وہ اسے پھانسنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ پرسوں رشید اور مقتول کی لڑائی ہوئی تھی۔

رفعت جونا، بہت خوبصورت لڑکی ہے اور امیر والدین کی بیٹی ہونے کی وجہ سے شوخ بھی ہے اس لیے لڑکوں کے کالج میں اس کا چرچا عام رہتا ہے۔ رشید بھی امیر کبیر خاندان کا لڑکا ہے۔

ان دونوں لڑکوں نے مزید بتایا کہ وہ ہوٹل میں شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے رشید کو کھانے کے ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ رُکا اور ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں پر نگاہ دوڑائی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد اُوپر سے کسی نے شور مچایا "قتل ہو گیا، لڑکا مارا گیا" ـــــ تمام لوگ جو ہال میں کھا پی رہے تھے، دوڑتے ہوئے اُوپر چلے گئے۔ ان دونوں لڑکوں نے جب اُوپر جا کر مقتول کو دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ اسے رشید قتل کر گیا ہے۔

قتل کی وجہ اور تحریک واضح تھی۔ مَیں نے دونوں لڑکوں پر جرح کی۔ وہ جو کچھ جانتے تھے مجھے بتا دیا مگر وہ موقعۂ واردات کے گواہ نہیں تھے۔ صرف گواہ تھے جو میری تفتیش کے لیے بہت ضروری تھے۔ وہ مبیّنہ ملزم رشید کے متعلق جانتے تھے کہ ہوسٹل میں رہتا ہے۔ رفعت کے گھر کا انہیں علم نہیں تھا۔ لہٰذا ان کی شہادت رشید کی گرفتاری کے لیے کافی نہیں تھی۔ رشید کو صرف شاملِ تفتیش کیا جا سکتا تھا۔

جس بیرے نے قاتل کو کمرے سے نکلتے دیکھا تھا، اس نے بیان دیا کہ مقتول کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے ایک تو چیخ سُنائی دی اور پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی کو اچانک بڑی سخت چوٹ لگی ہو اور وہ درد سے کراہ رہا ہو۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے اور ٹرے میں چائے کے برتن تھے۔ مقتول فرش پر پیٹ کے بل پڑا ہُوا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ اسی کی عمر کا ایک لڑکا ہاتھ میں چاقو لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ بیرا سخت گھبرا گیا۔ اگر وہ ہوش ٹھکانے رکھتا تو قاتل کو پکڑ سکتا تھا یا دوڑ کر باہر نکلتا اور دروازہ باہر سے بند کر دیتا۔ وہ ڈر گیا۔ قاتل نے چاقو پھینک دیا اور

گولی کی طرح دروازے کی طرف گیا۔ اس نے بیرے کو دھکا دیا۔ اس کی ٹرے گر پڑی، چائے دانی اور ایک پیالی ٹوٹ گئی۔ قاتل بھاگ گیا۔ بیرا چند سیکنڈ بعد سنبھل گیا۔ اس نے باہر آکر شور مچایا اور لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔

میں نے اس سے پوچھا ــــ "اگر قاتل تمہارے سامنے لایا جائے تو پہچان لو گے؟"

اس ادھیڑ عمر اور مریض صورت بیرے نے جواب دیا ــــ "حضور! اس کے پاس ایک آدمی کو ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے دیکھا تو میں اتنا ڈرا کہ میں وہاں سے بھاگنے لگا تھا۔ مجھے ایک کے تین تین نظر آنے لگے۔ مجھے تو اس کی شکل یاد ہی نہیں رہی۔ میں نے کہہ تو دیا ہے کہ قاتل مقتول کی عمر کا تھا لیکن حضور، اب شک ہو رہا ہے کہ وہ شاید بڑی عمر کا تھا ... اور حضور، ہو سکتا ہے چھوٹی عمر کا ہی ہو۔ مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔"

ایک گواہی اور ملی۔ وہ بھی ہوٹل کا بیرا تھا۔ وہ پچھواڑے کی سیڑھیوں کی طرف آ رہا تھا۔ وہاں روشنی کافی نہیں تھی۔ وہ سیڑھیوں سے آٹھ دس قدم دور تھا۔ اس نے اوپر سے شور سنا۔ "قتل ہو گیا۔ لڑکا مارا گیا" ــــ اس آواز کے ساتھ ہی ایک آدمی سیڑھیوں سے بہت تیز اترتا دیکھا۔ بیرا اور تیز چلا۔ سیڑھیوں سے اترنے والا آخری سیڑھی سے زمین پر گرا اور فوراً اٹھ کر دوڑ پڑا۔ بیرے نے "پکڑو۔ پکڑو" کا شور کیا۔ خود بھی اس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ آدمی تیز تھا۔ غائب ہو گیا ــــ یہ بیرا بھی قاتل کا حلیہ بیان کرنے سے قاصر تھا۔

میرے پاس صرف دو سٹوڈنٹ رہ گئے تھے۔ ان کے بیان کی روشنی میں، میں ان کے کلاس فیلو رشید کو مشتبہ فرد کی حیثیت سے تفتیش میں شامل کر سکتا تھا۔ اگر مجھے قابلِ اعتماد مزید شہادت یا موقعہ کا کوئی پکا گواہ مل جاتا تو میں مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے سے پہلے رشید کو گرفتار کر لیتا۔ گرفتاری کا ابھی پورا جواز نہیں ملا تھا۔ رشید کے

متعلق مجھے یہ فکر نہیں تھا کہ لاپتہ ہو جائے گا اور میں اس کا اتا پتہ معلوم نہیں کر سکوں گا۔ وہ سٹوڈنٹ تھا۔ اس کے کالج سے آسانی سے اس کا پتہ لیا جا سکتا تھا۔

میں نے سب کو کمرے سے نکال دیا اور دروازہ بند کر کے مقتول کی میز کی درازیں دیکھیں۔ ٹرنک کی چابی دراز میں سے ملی۔ ٹرنک کی چیزیں نکال کر دیکھیں۔ مقتول کے بستر کو سونگھا۔ چادر اٹھا کر اچھی طرح دیکھی۔ تکیہ بہت ہی غور سے دیکھا۔ میں کسی لڑکی کا کوئی خط، پلنگ یا تکیے پر لڑکی کا ایک آدھ بال یا کسی لڑکی کے عطر کی خوشبو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ میں نے ایک اور امکان پر غور کیا ــــ کیا ہوٹل کے مالک نے لڑکے کو قتل کرایا ہے اور قتل کا باعث کوئی لڑکی ہے؟

میں نے دوسرے کمروں میں رہنے والوں سے پوچھا۔ کسی نے شک کا اظہار بھی نہ کیا کہ یہاں کوئی لڑکی آتی ہے۔ مجھے خود بھی اس ہوٹل کے متعلق ایسا کوئی شک نہ تھا۔ میرے علاقے میں رہائش والے جو ہوٹل تھے ان پر میری سخت نگاہ تھی۔ یہ ہوٹل اس معاملے میں صاف تھا۔ البتہ یہ شک ضرور تھا کہ مقتول کے پاس کوئی کالجئیٹ لڑکی آتی ہو گی جس پر ہوٹل کے مالک کی نظر ہو گی۔

میں نے ہوٹل کے مالک، دونوں بیروں اور دونوں لڑکوں کو تھانے بھیج دیا اور کہا کہ وہاں میرا انتظار کریں۔ دوسرے کمروں میں رہنے والوں سے میں نے پوچھا کہ انہوں نے کسی کو بھاگتے دیکھا تھا؟ ــــ کسی نے بھی نہیں۔ میں نے سب کی فہرست تیار کی اور یہ بھی لکھا کہ کون کیوں، کب سے اور کب تک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے اور اس کا تعلق کہاں کہاں ہے۔ اس کے بعد میں نے لاش کے متعلق کاغذات تیار کیے۔ برآمدگی کے دو گواہ بنا کر ان کے دستخط لیے۔ لاش باہر نکلوائی۔ کمرہ بند کیا اور تالے کو سربمہر کر دیا۔

# بستر پر لڑکی کا بال، چوڑی کا ٹکڑا

یہ بیان لینے اور کاغذات تیار کرنے میں تین گھنٹے گزر گئے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور میں رشید کے ہوسٹل کی طرف روانہ ہوا۔ تانگے نے وہاں تک پہنچاتے پہنچاتے بیس منٹ لگا دیئے۔ آدھی رات ہو گئی تھی۔ چوکیدار سے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کا پتہ معلوم کیا۔ وہ ساتھ ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کو جگایا۔ وہ ہندو تھا۔ پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا میں نے اسے تسلی دلاسا دے کر بتایا کہ تھرڈ ایئر کے سٹوڈنٹ رشید کا کمرہ بتا دے اور خود ساتھ چلے۔

اس سے مقتول اور رشید کے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا۔ "اگر آپ مسلمان ہیں تو برا نہ منانا۔ مسلمان جاگیرداروں اور انگریزوں کے انعام خور باپوں کے مسلمان لڑکوں نے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ شہزادوں کی طرح رہتے ہیں۔ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور غریب مسلمانوں کے لڑکے دیکھیں۔ تعلیم میں دھیان رکھتے ہیں لیکن امیر مسلمانوں کے بیٹے کالج اور ہوسٹل میں عیش کرنے آتے ہیں۔ رشید کے متعلق مجھے کئی رپورٹیں ملی ہیں۔ اس کے کمرے میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی آتی ہے۔ کبھی تو دو دو تین تین گھنٹے کمرے میں اس کے ساتھ رہتی ہے اور کبھی رشید اس کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ مقتول کو بھی میں جانتا ہوں، اسی قماش کا لڑکا تھا۔ مجھے یہ بالکل معلوم نہیں کہ ان کی آپس میں کوئی دشمنی تھی یا نہیں۔"

رشید کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ دستک دی تو دروازہ فوراً کھل گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ رشید سویا ہوا نہیں تھا۔ اس نے بتی جلا دی تھی۔ میں نے ایک نظر میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے پاجامہ اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ بہت صاف تھی۔

میں نے اسے مسکرا کر کہا۔ "گھبراؤ نہیں بیٹا۔ میں تمہیں گرفتار کرنے نہیں آیا۔ تمہارا ایک دوست قتل ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق تم سے دو چار باتیں پوچھنی ہیں۔"

اس نے فوراً کہا۔ "وہ مر گیا ہے؟"

اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ کون سا دوست قتل ہوا ہے؟ کہاں قتل ہوا ہے؟ کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے یہ پوچھ کر کہ وہ مر گیا ہے، میرا شک پختہ کر دیا کہ قاتل یہی ہے اور اگر یہ نہیں تو اسے علم ضرور ہے۔ میں نے اسے کہا۔ "تم نے چاقو ایسی جگہ مارا ہے کہ اس کے بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔"

وہ سنبھل گیا بلکہ بدک گیا اور ہکلا کر کہنے لگا۔ "میں نے اسے چاقو مارا ہے؟ آپ کس کے متعلق بات کر رہے ہیں؟ میں تو سویا ہوا تھا۔" اس کا لہجہ اور انداز اس کے خلاف گواہی دے رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "آج شام تم نے کون سے کپڑے پہنے تھے؟"

اس نے کھونٹی سے لٹکا ہوا ایک سوٹ اور قمیض دکھائی۔ میں نے ان کپڑوں کو اچھی طرح دیکھا، خصوصاً پتلون کو۔ پھر میں نے اس کی ساری پتلونیں دیکھیں جو اس نے میرے کہنے پر میرے سامنے رکھ دیں۔ اس کے بستر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاید اس نے واردات کے وقت پہنے ہوئے کپڑے چھپا دیئے ہوں۔ بظاہر یہ باقاعدہ تلاشی نہیں تھی لیکن میں نے باتوں باتوں میں تلاشی مکمل کر لی۔ وہ واقعی بہت امیر لڑکا تھا۔ ایک ٹرنک اور چمڑے کے دو اٹیچی کیس تھے۔ کپڑوں کی الماری تھی۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ میں نے اس کے نیچے بھی دیکھا۔ میز کی درازیں بھی دیکھیں۔ میں اس دوران اس سے غیر متعلق سی باتیں کرتا رہا۔ کوئی سیدھی چوٹ نہ کی اور میں اس کا انداز اور اس کے چہرے کو بھی دیکھتا رہا۔

مجھے وہ مشتبہ نظر آ رہا تھا، میں نے اس کی ساری پتلونیں اس لیے غور سے دیکھی تھیں کہ ایک بیرے کے بیان کے مطابق وہ نیچے والی آخری سیڑھی سے گرا تھا۔ لہٰذا اس کی پتلون پر رگڑ اور گرد کا نشان ضرور ہونا چاہیے تھا۔ قمیص یا کوٹ پر خون کا کوئی داغ یا دھبہ ہونا چاہیے تھا مگر مجھے ایسا کوئی نشان نہ ملا۔ اس کے بوٹ دیکھے نیچے سے تلوے دیکھے۔ صاف تھے۔

میں اسے تھانے لے گیا۔ اس کے کمرے کی چابی اپنے پاس رکھ لی۔ اس کی تحریر لکھ کر ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کو دے دی تھی اور ایک اور ضروری تحریر پر اس کے دستخط لے لیے تھے۔ اس وقت تک رشید سنبھل چکا تھا۔ تانگے میں وہ کبھی مجھ سے اُلجھ پڑتا کہ میں اسے بلاوجہ پریشان کر رہا ہوں اور کبھی منت سماجت کرنے لگتا کہ اسے چھوڑ دوں اس کا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اسے صرف تسلیاں دیتا رہا۔ واردات کے متعلق کوئی بات نہ کی نہ پوچھی۔

تھانے میں گئے تو میں نے اسے اپنے دفتر میں اکیلا بٹھا لیا اور کہا۔ "دیکھو بیٹا! اپنے دماغ سے یہ غلط فہمی نکال دو کہ تمہارے باپ کی دولت اور رسوخ تمہیں قانون کے پنجے سے چھڑا لے گا۔ بادشاہی انگریزوں کی ہے۔ یہ کسی مہاراجے کی ریاست نہیں۔ اگر تم غصے میں آکر قتل کر بیٹھے ہو تو مجھے صاف صاف بتا دو۔ میرے پاس ایسے طریقے موجود ہیں جن سے میں تمہیں نہایت معمولی سزا دلا سکتا ہوں ورنہ سیدھے پھانسی کے تختے پر جاؤ گے۔"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" لڑکا تیز ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "آپ پہلے مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر لیں۔"

میں نے اپنے مزاج میں گرمی پیدا نہ ہونے دی اور نہ ہی میں تشدد کا قائل تھا۔ انگریز افسروں سے میں نے کچھ گُر سیکھ لیے تھے، وہ مشکل کے وقت میں مدد کرتے تھے۔ ایک گُر یہ تھا کہ تھانیداروں کی طرح رعب نہ جھاڑو اور کوئی غصہ دلائے تو غصہ نہ کرو۔ ملزم اور مشتبہ کو

دوستی اور ہمدردی کا جھانسہ دو اور اس کی دکھتی رگیں پہچانو — میں نے رشید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "بیٹا! میں نصیبہ تو نہیں کہا کہ تم نے قتل کیا ہے۔ میں تو ابھی بہت سے آدمیوں سے یہی بات کہوں گا جو تمہیں کہہ چکا ہوں۔ تم مسلمان کے بیٹے ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں بلاوجہ تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ ایک مسلمان لڑکا ہندوؤں اور سکھوں کے سامنے ایک لڑکی کی دوستی کے سلسلے میں قتل کے الزام میں عدالت میں پیش کیا جائے۔ تم ذرا میری مدد کرو۔ رفعت کیسی لڑکی ہے؟ تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ بھی اس کی دوستی ہے؟"

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ مجھ سے پوچھا۔ "آپ رفعت کو کس طرح جانتے ہیں؟"

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رفعت پر تمہاری اور مقتول کی چپقلش تھی" — میں نے اسے بتایا — "تمہاری اور مقتول کی ہاتھا پائی بھی ہو چکی ہے۔ تم آج شام اس ہوٹل میں گئے تھے جہاں مقتول رہتا تھا۔ تم اسے قتل کر چکے تو ایک بیرا اندر آ گیا۔ تم اسے دھکا دے کر بھاگ گئے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم آخری سیڑھی سے گرے تھے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنی چھ پتلونیں دکھائی ہیں اور تم نے ساتویں پتلون کہیں چھپا دی ہے۔ تمہارے کمرے میں رفعت کے ایسے نشان موجود ہیں جنہیں تم چھپا نہیں سکتے۔ کمرے کی چابی میرے پاس ہے اور....." میں نے اسے کہا۔ "مجھے وہ ایسی باتوں کا علم ہے جو تم سمجھتے ہو کہ کسی کو بھی معلوم نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ دو باتیں تم خود مجھے تفصیل سے بتا دو تا کہ میں اس تعاون کے بدلے تمہیں پھانسی اور عمر قید سے بچا سکوں۔"

اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ میں نے اسے پوری طرح

پچھاڑنے کے لیے پوچھا ــــ "رفعت کی سبز رنگ کی چوڑیاں تمہاری پسند ہے یا رفعت کی؟"
وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ میں نے کہا ــ "گوری رنگت کی کلائی پر گہرا سبز رنگ کوئی اچھی پسند نہیں۔ یہ تو دیہاتی سا ذوق ہے۔ میں جب تمہاری طرح نیا نیا جوان ہوا تھا تو بھورے بالوں والی گورے رنگ کی لڑکی کی کلائیوں پر فیروزی رنگ کی چوڑیاں پسند کیا کرتا تھا۔"

وہ اچانک سکتے سے بیدار ہو گیا اور بولا "آپ رفعت سے مل چکے ہیں؟ اس نے کیا کہا تھا؟"

"ابھی نہیں بتاؤں گا کہ اس نے کیا کہا تھا" ــــ میں نے جواب دیا ــ "میں اس سے مل چکا ہوں" ــــ میں نے جھوٹ بولا۔ اس لڑکی کو میں نے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ رشید کے کمرے میں جب میں نے اس کے کپڑے اور بستر دیکھا تھا تو اس کے تکیے کے کنارے پر ایک لمبا بال نظر آیا۔ یہ ایک پولیس مین کی نظر تھی جس نے یہ بال دیکھ لیا تھا۔ کسی دوسرے آدمی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے یہ بال رشید کی نظر بچا کر انگلیوں میں پکڑا اور اسے اس وقت غور سے دیکھا جب رشید اپنے ٹرنک میں سے مجھے دکھانے کے لیے کپڑے نکال رہا تھا۔

بال بہت باریک اور بھورے رنگ کا تھا۔ یہ کسی عام سی عورت کا بال نہیں تھا۔ بھورے بال ہمیشہ گورے رنگ کے انسان کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ گورے رنگ کی کلائی پر سبز چوڑیاں اچھی پسند نہیں ہے۔ اس لڑکی کی چوڑیوں کا رنگ مجھے رشید کے کمرے میں ہی نظر آگیا تھا۔ اس کے پلنگ کے ایک پائے کے ساتھ دری کی سلوٹ میں سبز رنگ کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا کوئی ایک انچ لمبا ٹکڑا پڑا تھا۔ وہ میں نے اٹھایا نہیں صرف دیکھا تھا۔ یہ بال اور چوڑی کا ٹکڑا رفعت کا ہی ہو سکتا تھا۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی اس کے کمرے

میں آتی ہے اور دیر تک وہاں رہتی ہے۔
اور رشید کو یقین ہو گیا کہ میں اس کے کمرے میں جانے سے پہلے رفعت سے مل چکا ہوں۔
اس کا سر جھک گیا۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ وہ اقبالِ جرم کرلے گا۔ اس نے سر اٹھایا اور کہا۔
"یقین کریں انسپکٹر صاحب، میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

# قاتل خود آ گیا

میں اپنی جرح کا اگلا گولا داغنے ہی لگا تھا کہ میرے دفتر کے دروازے میں ایک آدمی آن کھڑا ہوا۔ میں سمجھا کہ رشید کا کوئی عزیز ہو گا۔ میں نے رشید کو دیکھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر رشید چونک گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر بڑی صاف تبدیلی دیکھی۔ اس آدمی کی عمر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ بیالیس سال ہے لیکن چہرہ اتنا شگفتہ تھا کہ میری سراغرساں نگاہوں میں زیادہ سے زیادہ اٹھائیس سال کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "میں تفتیش میں مصروف ہوں۔ آپ باہر انتظار کریں۔"

باہر جانے کی بجائے وہ میری میز کے قریب آ گیا اور کہا۔ "ہوٹل کے کمرے میں جو لڑکا قتل ہوا ہے اس کا قاتل میں ہوں۔"

میری تمام سروس میں شاید یہ ایک ہی موقع آیا تھا کہ میں بوکھلایا اور مضطرب ہو گیا۔ میں نے ایسے قاتل بھی دیکھے تھے جو میری جرح سے گھبرا کر اپنا جرم مان جاتے تھے اور ایسے قاتل بھی میرے پاس آتے جنہوں نے اپنی بیوی کو یا اس کے آشنا کو یا دونوں کو قتل کیا اور آلۂ قتل کے ساتھ تھانے میں آئے اور اقبالِ جرم کر لیا۔ ہر پولیس انسپکٹر کو خوشی ہوتی ہے

کہ تفتیش اور سراغرسانی سے بچے مگر اس آدمی نے آکر کہا کہ میں اس لڑکے کا قاتل ہوں تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اس آدمی نے مجھے سر کے بل پٹخ دیا ہو۔ چند سیکنڈ تو میری زبان بند رہی جیسے میں بول بھی نہیں سکتا۔ میں دراصل رشید کو قاتل قرار دے چکا تھا اور میں اس کے اقبالِ جرم، ثبوت اور شہادت کی فکر میں تھا۔ اس آدمی نے مجھے گمراہ کر دیا۔

تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر کے سامنے کوئی قاتل اقبالِ جرم کرے تو اسے اتنی خوشی ہوتی ہے جیسے اس کی بے اولاد بیوی نے اچانک بچہ جن دیا ہو مگر میں اس آدمی کے اقبالِ جرم سے معلوم نہیں کیوں خوش نہ ہوا۔ اگر کوئی آدمی تھانے میں جا کر کہے کہ میں نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے اور وہ لاش بھی برآمد کرا دے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ پولیس اسے فوراً عدالت میں لے جا کر سزا دلوا دے گی۔ پولیس کو استغاثہ، ثبوت، شہادت، آلۂ قتل وغیرہ عدالت میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ اگر استغاثہ کمزور ہو تو اقبالِ جرم کر کے بھی قاتل بری ہو جاتے ہیں۔

اچانک میرا دماغ میرے قابو میں آگیا۔ سب سے پہلے میں نے اس کی پتلون پر نظر ڈالی۔ اس کے دونوں گھٹنوں پر رگڑ کے نشان تھے اور ان پر تھوڑی تھوڑی مٹی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ اتنی اچھی پتلون آپ نے کہاں خراب کی ہے؟"

"میں اس لڑکے کو قتل کر کے بڑے آرام سے وہاں سے نکلنا چاہتا تھا" —— اس نے جواب دیا —— "مگر ایک بیرا اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر میں تیزی سے بھاگا اور بیرے کو دھکا دے کر باہر نکل گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی وہ گر پڑی۔ میں دوڑتا ہوا پچھواڑے کی سیڑھیوں سے اترا۔ آخری سیڑھی سے میں گھٹنوں کے بل زمین پر گرا۔ اوپر سے اس بیرے نے شور مچایا تو نیچے ایک آدمی میرے پیچھے دوڑا۔ میں اٹھ کر بھاگا اور نکل گیا۔ میں نے مٹی بہت دور جا کر جھاڑی تھی لیکن پوری طرح صاف نہیں ہوئی۔"

اگر یہ آدمی اپنے دفاع میں بیان دے رہا ہوتا تو میں اس پر سوالوں کا جال پھینکتا۔ وہ تو اقبالِ جرم کر رہا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا لیا اور اس سے پوچھا۔ ”آپ مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ کا دماغ ٹھکانے ہے اور آپ بقائمی ہوش و حواس اقبالِ جرم کر رہے ہیں؟“

”آپ ہی بتائیں کہ یقین کس طرح دلایا جا سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”آلہ قتل کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جو آپ کمرے سے اٹھا لائے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک چاقو تھا جو میرا نہیں مقتول کا تھا۔“

میں نے اپنی میز پر رکھا ہوا چاقو جو کاغذ میں لپٹا ہوا تھا اور جسے اس پر لگے ہوئے خشک خون کے کیمیادی معائنے کے لیے بھیجنا تھا، کاغذ سے نکال کر اسے دکھایا۔ اس نے چاقو کا دستہ اپنی مٹھی میں لے لیا اور کہا۔ ”جی یہی چاقو تھا۔“ اس نے چاقو مجھے دے دیا۔

یہ کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی پتلون قیمتی تھی اور اس نے بند گلے والا جو سویٹر پہن رکھا تھا وہ بھی قیمتی تھا مگر سویٹر سامنے سے اس طرح پھٹا ہوا تھا جیسے کسی نے قینچی سے کاٹا ہو۔ پھٹی ہوئی جگہ تقریباً تین انچ تھی۔ میں اس سے پوچھنے لگا تھا کہ یہ سویٹر کس طرح پھٹا ہے لیکن میری زبان پر یہ سوال آ گیا۔ ”آپ نے اسے تقریباً کتنے بجے قتل کیا تھا؟“

”ساڑھے آٹھ بجے کے لگ بھگ۔“

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”اب رات کے دو بج کر سات آٹھ منٹ ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کو اقبالِ جرم ہی کرنا تھا تو اتنی دیر سے کیوں آئے؟ اور یہاں آنے کا آپ نے فیصلہ کس طرح کیا؟“

”میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میں اسے سمجھانے بجھانے آیا تھا۔

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے میز کی دراز سے چاقو نکال لیا اور پوری طاقت سے مجھ پر وار کیا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چاقو میرے سویٹر میں لگا" ــــ اس نے سویٹر کی پھٹی ہوئی جگہ دکھا کر کہا ــــ "یہ دیکھئے ..... جب اس نے مجھ پر چاقو سے حملہ کیا تو میں غصّے سے پاگل ہو گیا۔ مجھے یہ بالکل خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے قتل کر سکے گا۔ میں اس کے ہاتھوں قتل ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے مجھے اتنا غصہ دلایا کہ میں نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ قتل اور خودکشی ایک لمحے کے پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ پاگل پن میرے دماغ پر غالب آ گیا تھا۔ اس نے چاقو کا دوسرا وار کیا۔ میں نے اس کی چاقو کے ہاتھ والی کلائی پکڑ لی اور اس کا بازو اتنی شدت سے مروڑا کہ چاقو اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے چاقو اٹھا کر اس کے عین دل میں اتار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے چیخ ماری۔ ایک بیرا اندر آ گیا۔ اس وقت لڑکا فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے چاقو پھینک دیا اور دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے بیرے کو دھکا دیا اور نکل گیا۔"

"قتل کی وجہ کیا تھا؟" ــ میں نے پوچھا۔

"ایک لڑکی۔"

"آپ کی عمر کتنی ہے؟"

"بیالیس سال۔"

"بیالیس سال؟" میں نے حیران ہو کر کہا ــ "آپ عمر کی نسبت جوان نظر آتے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا ــ "اس عمر میں لڑکی کی خاطر قتل؟" ــــ میں فوراً سنجیدہ ہو گیا اور پوچھا ــ "کہیں وہ لڑکی آپ کی بیٹی یا بہن تو نہیں؟"

"میں اسے جانتا تک نہیں۔" اس نے کہا ــ "میرا دفتر لڑکیوں کے کالج کے قریب ہے۔ میں نے دو دفعہ دفتر سے گھر کو جاتے ہوئے اس لڑکے کو ایک لڑکی کا پیچھا کرتے اور اسے

پریشان کرتے دیکھا۔ تیسری بار میں نے پھر لڑکے کو یہی بدتمیزی کرتے دیکھا۔ میں پاس سے گزر رہا تھا۔ لڑکی نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے لڑکے کو منع کیا تو اس نے میری بے عزتی کر دی۔ میں نے اس لڑکے کو پیٹا۔ میں کچھ جذباتی سا آدمی ہوں۔ دوسرے دن میں کالج کے قریب چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکیاں کالج سے نکلیں تو یہ لڑکا کہیں سے آگیا اور دور جا کر لڑکی کے پیچھے ہو گیا۔ میں نے جا کر لڑکے کو پکڑ لیا۔ لڑکی سے کہا کہ تم چلی جاؤ۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لڑکے نے مجھے گالیاں دیں اور کہا۔ "کل تم یہاں آنا۔ تمہاری لاش یہاں سے اٹھائی جائے گی"۔ اس نے یہ بھی کہا۔ "اگر یہ لڑکی تمہاری بیٹی ہے تو کل میں اسی سڑک پر اس کے کپڑے اتار دوں گا"۔ مجھے لوگوں نے پکڑ رکھا تھا۔ لڑکا چلا گیا۔ کالج کے کچھ سٹوڈنٹ وہاں کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ بڑا ڈھیٹ اور بدمعاش لڑکا ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اس کا گھر کہاں ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کہیں اور کا رہنے والا ہے۔ یہاں (فلاں) ہوسٹل میں رہتا ہے۔ ایک لڑکے نے مجھے اس کے کمرے کا نمبر بھی بتا دیا۔ میں شام تک کوشش کرتا رہا کہ غصے پر قابو پا لوں مگر ناکام رہا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اگر وہ میری بات سن لیتا تو قتل نہ ہوتا۔ اس نے مجھ پر چاقو سے حملہ کر دیا۔"

"تو آپ اپنے ڈیفینس کی یہ لائن اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اسے اپنی جان بچانے (حفاظتِ خود اختیاری) کے لیے قتل کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں ایسا کوئی گواہ پیش نہیں کر سکتا کہ اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔"

"میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا۔" میں نے کہا۔ "کہ آپ کو اتنی دیر بعد اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کا خیال کیسے آیا؟"

"میں جرائم پیشہ، غنڈہ یا لوفر لفنگا نہیں ہوں" اس نے جواب دیا۔ "قتل جیسے بھیانک جرم کے متعلق تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ میرے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ایک تو یہ پاگل پن تھا جس نے مجھ سے قتل کرایا۔ قتل کر کے مجھ پر ایک اور ہی قسم کا پاگل پن سوار ہو گیا۔ ایسی بے چینی کہ مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ حالانکہ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ مر گیا ہو گا۔ سنا ہے کہ لوگ جرم کے بعد شراب پیتے ہیں لیکن میں تو سگریٹ کا بھی عادی نہیں۔ شراب کبھی سونگھی نہیں۔ میں پاگلوں کی طرح سڑکوں پر پھرتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب مجھے خیال آیا کہ ہوٹل میں جا کر دیکھوں، شاید وہ زندہ ہو۔ میں نے گھر جا کر انہی کپڑوں پر اوور کوٹ پہنا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ رکھا تاکہ مجھے کوئی پہچان نہ سکے۔ ہوٹل ابھی کھلا تھا۔ کچھ لوگ ہوٹل کے باہر کھڑے اسی واقعہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ 'سنا ہے یہاں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟' ——ایک آدمی نے جواب دیا—— 'آپ جھگڑا کہتے ہیں۔ یہاں تو ایک جوان لڑکا قتل ہو گیا ہے۔ لاش کمرے میں پڑی ہے اور پولیس آئی ہوئی ہے'۔۔۔

"میں وہاں سے کھسک گیا۔ اپنے گھر چلا گیا۔ سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند نہ آئی۔ رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ میں اب یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پولیس نے کیا کارروائی کی ہے۔ میں پولیس سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میرا ارادہ تھا کہ پولیس سٹیشن کے باہر کوئی آدمی ملا تو اس سے پوچھوں گا۔ مجھے بالکل یہ خیال نہیں تھا کہ آپ دفتر میں موجود ہوں گے۔ میرا تو دراصل دماغ خراب ہو گیا تھا اور میرے اندر جو بے چینی تھی وہ مجھے باہر کو دھکیل رہی تھی۔ میں یہاں تک آیا تو تھانے کے باہر دو آدمی کھڑے تھے۔ ان سے کہا کہ سنا ہے آج ایک لڑکا قتل ہو گیا ہے۔ قاتل پکڑا گیا ہے یا نہیں؟ انہوں نے بتایا کہ پولیس قاتل کو پکڑ لائی ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کالج کا ایک سٹوڈنٹ ہے۔۔۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل ٹہلتا ٹہلتا احاطے سے باہر آیا۔ ان دو

آدمیوں میں سے ایک نے اس سے پوچھا کہ قاتل یہی ہے یا اسے شک میں پکڑا ہے؟ کانسٹیبل نے گالی دے کر کہا کہ یہی ہے۔ ثبوت پکا مل گیا ہے۔ ابھی اس سے اقبالِ جُرم کرا لیا جائے گا....

"میں نے یہ سنا تو میرے دماغ میں یہی خیال آیا کہ پولیس نے ایک بے گناہ کو پکڑ لیا ہے۔ ایک سٹوڈنٹ کو میں نے قتل کر دیا ہے اور دوسرا اسٹوڈنٹ پکڑا گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کمسنی کی وجہ سے پولیس سے ڈر کر بے گناہ پھنس جائے۔ مجھے یہ ڈر بھی محسوس ہُوا کہ پولیس اس پر تشدد کر کے اس سے جھوٹا اقبالِ جرم کرا لے گی۔ میں برداشت نہ کر سکا کہ میرے جرم کی سزا کسی اور کو ملے۔ میں تھانے کے گیٹ میں داخل ہو گیا اور سیدھا آپ کے پاس آ گیا۔"

اس نے رشید کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "آپ نے اس لڑکے کو پکڑا ہے شاید؟.. اسے چھوڑ دیں اور جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں"۔ اس نے لمبا سانس لیا اور کہا۔ "اقبالِ جرم کر کے مجھے سکون محسوس ہو رہا ہے۔"

"کیا آپ کو یہ بھی احساس ہے کہ آپ کا انجام کیا ہو گا؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "میں نے ابھی کوئی کاغذی کارروائی آپ کے متعلق نہیں کی۔ میں آپ کو سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔"

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "مجھے سوچنے کا موقع نہ دیں۔"

## پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا

اس آدمی نے اپنا نام وسیم خان بتایا۔ وہ اپنا دفاع نہیں بلکہ اقبالِ جرم کر رہا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کی پتلون جو گھٹنوں سے رگڑی ہوئی تھی ثابت کر رہی تھی کہ یہی قاتل ہے۔ پھر بھی مجھے اقبالِ جرم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قابلِ یقین شہادت کی ضرورت تھی۔ ملزم کو

پہچاننے کے لیے قانون نے ایک طریقہ وضع کر رکھا ہے جسے شناخت پریڈ کہتے ہیں۔ ملزم کو سات آٹھ غیر متعلق آدمیوں میں کھڑا کر کے گواہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان میں سے ملزم کو پہچانے۔ یہ پریڈ ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں کی جاتی ہے لیکن میں نے اس طریقۂ کار سے انحراف کیا۔ ایک آدمی اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر رہا تھا۔ مجھے یہ یقین کرنا تھا کہ وہ واقعی قاتل ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رشید کو بچانے کے لیے مجھے گمراہ کر رہا ہے؟ ۔۔ میں نے تمام گواہوں کو تھانے میں بلا رکھا تھا۔ ان میں اس بیرے کو اندر بلایا جو چیخ سُن کر مقتول کے کمرے میں گیا تھا۔

اسے کہا کہ ان دونوں (رشید اور وسیم خان) کو دیکھو اور اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ تم نے مقتول کے پاس کیسے دیکھا تھا۔

بیرے نے دونوں کو باری باری دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ رشید خاموش بیٹھا رہا۔ وسیم نے اسے کہا۔ "تمہارے ہاتھ میں ٹرے تھی جب تم اندر آئے تھے۔ میرے دھکے سے تمہاری ٹرے گری نہیں تھی؟"

یہ بیرا مجھے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ وہ اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ وہ ملزم کو اچھی طرح پہچان نہیں سکا۔ اب اس نے وسیم خان کو دیکھا اور اس کی بات سُنی تو وثوق سے بولا "یہی (وسیم خان) تھا۔"

میں نے اس کی شناخت کو اس لیے تسلیم کر لیا کہ وسیم خان نے خود ہی اشارہ دے دیا تھا۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وسیم خان نے اپنے خلاف ایک شہادت کو خود ہی پکا کر دیا۔

میں نے دوسرے بیرے کو بلایا جس نے ایک آدمی کو آخری سیڑھی سے گرتے دیکھا تھا۔ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اس نے چہرہ نہیں دیکھا، قدبت دیکھا تھا۔ وہاں روشنی بہت تھوڑی تھی۔ بہرحال اس کے کہنے پر وسیم خان کرسی سے اٹھا۔ بیرے نے اسے دائیں بائیں اور پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا اور کہا۔ "یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"تم اس ہوٹل میں گئے تھے؟" ــــ میں نے رشید سے کہا ــــ "تمہیں وہاں دیکھا گیا تھا اور تم اُوپر بھی گئے تھے۔ کیوں گئے تھے؟"

"میں اس لڑکے سے ملنے گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ مفت کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میری اور اس کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ میں یہ سوچ کر اس کے کمرے میں جا رہا تھا کہ اسے دوستانہ طریقے سے سمجھاؤں گا۔ میں لڑائی جھگڑے کی نیت سے نہیں گیا تھا۔ میں ابھی اس کا کمرہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ کسی نے "قتل، قتل" کا شور مچایا۔ لوگ دوڑے آئے، ذرا سی دیر میں وہاں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے وسیم خان کو دیکھا تھا؟ اس نے جواب دیا۔ "میں کسی کو پہچان نہیں سکا۔ وہاں بہت سے لوگ دوڑ رہے تھے۔ پھر میں نے مقتول کو دیکھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ کسی لڑکی کا بھائی یا باپ اسے قتل کر گیا ہے۔ لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ اس کی عادت تھی۔"

میں نے وسیم خان، رشید اور بیروں سے جو سینکڑوں سوال پوچھے اور انہوں نے جو جواب اور بیان دیئے وہ میں بہت ہی اختصار سے سُنا رہا ہوں۔ اگر اپنی تفتیش کی ساری کارروائی لکھوں تو چار سو صفحوں کی کتاب بن جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے اختصار سے کوئی پولیس آفیسر میری تفتیش کو ناقص سمجھے لیکن مجبوری ہے کہ ہر ایک سوال اور اس کا جواب لکھنا ممکن نہیں۔ البتہ کوئی بھی پولیس آفیسر میری اس کارروائی پر اعتراض نہیں کرے گا کہ میں نے رشید کو خارج از تفتیش کر دیا اور وسیم خان کو حراست میں لے لیا۔ وسیم خان اقبالِ جرم کر رہا تھا اور وہ اپنے خلاف شہادت بھی مہیا کر رہا تھا اور اس کا یہ اقدام کسی خوف، اذیت یا لالچ کا نتیجہ نہیں تھا۔

میں نے دوسرے دن وسیم خان کو ایک مجسٹریٹ کے حوالے کر دیا۔ مجسٹریٹ نے اس

کا اقبالی بیان قلمبند کر کے بیان اپنے پاس رکھ لیا۔ اس سربمہر لفافے کو اب عدالت میں کھلنا تھا۔ وسیم خان نے مجھے جو بیان دیا تھا اس کے مطابق میں نے گواہ اور ثبوت وغیرہ اکٹھے کرنے شروع کر دیئے۔ ہوٹل کے مالک، دو بیروں، دو مشیروں اور دو دوسروں سے گواہوں کے علاوہ رفعت کو بھی گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ میں نے رفعت کو پہلی بار دیکھا تو میں اس کے حسن سے چونک اٹھا۔ میرا قیاس بالکل صحیح تھا۔ اس کے بال بھورے، رنگ گورا اور اس کی چوڑیوں کا رنگ گہرا سبز تھا۔ ایک کلائی میں چار اور دوسری میں دو چوڑیاں تھیں۔ اس نے مقتول کے متعلق بیان دیا کہ وہ اسے بہت پریشان کرتا تھا۔ وسیم خان کے اس بیان کی اس نے تائید کی کہ وسیم خان نے اسے پہلے دو تین بار روکا پھر اس کی پٹائی کی تھی۔

ان کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کی اور اقبالی بیان قلمبند کرنے والے مجسٹریٹ کی گواہی بھی تھی۔ ثبوت میں جو چیزیں رکھیں ان میں آلۂ قتل اور وسیم خان کی پتلون تھی جو گھٹنوں سے رگڑی ہوئی تھی۔ میں نے تین گواہ ایسی صورت کے لیے تیار رکھے ہوئے تھے کہ اگر وسیم خان اقبالِ جرم سے منحرف ہو جائے تو پیش کروں گا۔

استغاثہ کو پوری طرح مضبوط کر کے بھی مجھے کچھ خلا نظر آ رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایک خدشہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وسیم خان رشید کو بچانے کے لیے ناٹک کھیل رہا ہے؟ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ رشید قتل کر کے وسیم خان سے ملا ہو اور وسیم خان نے اس سے ساری باتیں سن کر اپنے آپ کو پیش کر دیا ہو۔ گو ایک عام شہری پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے اتنی باریکیوں کو ذہن میں نہیں لا سکتا۔ پولیس کے پاس ہر دھوکے کا توڑ ہوتا ہے۔ پھر بھی ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے میرے دل سے وسوسہ نکلا نہیں اور میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر وسیم خان کا وکیل قابل ہوا تو وہ اسے شک کی بنا پر بری کرا سکتا ہے مگر

پہلی پیشی پر وسیم خان وکیل کے بغیر عدالت میں لایا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اقبالِ جرم کر چکا ہے، اس لیے صفائی کے لیے وکیل نہیں لانا چاہتا۔ مجسٹریٹ نے اسے کہا کہ وکیل ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے ایک وکیل لے لیا۔ وکیل نے پہلی پیشی کے بعد استغاثہ کا جائزہ لیا تو اسے کہا کہ وہ اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے کیونکہ استغاثہ کمزور ہے اور وہ اسے شک کا فائدہ دلا سکے گا لیکن وسیم خان منحرف نہ ہُوا۔ اپنے اقبالی بیان پر قائم رہا۔

مجسٹریٹ نے کیس سیشن کورٹ کے سپرد کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وسیم خان وہاں جا کر اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے گا اور اس کا وکیل استغاثہ کے کمزور گواہوں پر جرح کر کے کیس بری کرا لے گا۔ میرا سب سے زیادہ اہم گواہ سب سے زیادہ کمزور تھا، یہ وہ بیرا تھا جس نے وسیم خان کو کمرے میں مقتول کی لاش کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ سیشن کورٹ میں صفائی کے وکیل نے اس پر جرح کر کے سیشن جج کے دل میں یہ شک پیدا کر دیا تھا کہ یہ بیرا قابلِ اعتماد گواہ نہیں اور یہ گواہ دراصل موقعہ کا گواہ ہے ہی نہیں۔

وکیل نے میرے تمام گواہوں کو کمزور کر دیا لیکن وسیم خان کا جب آخر میں بیان ہُوا تو اس نے اپنے وکیل کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور ثابت کر دیا کہ تمام گواہوں نے سچ بولا ہے اور یہ قتل اسی نے کیا ہے۔

## میری ہمدردی قاتل کے ساتھ

مجھے توقع تھی (اور میری دلی خواہش بھی یہی تھی) کہ سیشن جج وسیم خان کی صاف گوئی کا صلہ ضرور دے گا اور اسے سزائے موت نہیں دے گا، مگر اس کی بدقسمتی کہ سیشن جج

انگریز تھا اور بڑا ہی ظالم اور بدخو جج تھا۔ ہندوستانیوں سے وہ نفرت کرتا تھا۔ اگر ہندوستان کی بادشاہی صرف ایک دن کے لیے اسے دے دی جاتی تو وہ ہندوستان کی تمام تر آبادی کو سزائے موت دے دیتا۔ اس کا لکھا ہوا فیصلہ اس قدر مدلل اور پُرمغز ہوتا تھا کہ اس کے فیصلوں کے خلاف بہت ہی کم اپیلیں ہائی کورٹ منظور کرتی تھی۔ وسیم خان کو بھی اس نے سزائے موت دے دی جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔

پولیس والوں کو کسی کی سزایابی پر افسوس نہیں ہوا کرتا لیکن وسیم خان سے میں اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس کی شخصیت میرے ذہن میں نقش ہو گئی۔ وسیم خان نے جب عدالت میں فیصلے کے یہ الفاظ سنے کہ اس فیصلے کے خلاف ایک ہفتے کے اندر اندر اپیل کی جا سکتی ہے تو اس نے انگریزی میں کہا۔ "میں اس فیصلے کے خلاف اپیل نہیں کروں گا۔"

رفعت تقریباً ہر پیشی پر عدالت میں آتی تھی۔ رفعت کا باپ اور رشید تو ہر پیشی پر ضرور موجود ہوتے تھے۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ وسیم کو مجبور کرتے رہتے تھے کہ وہ اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے۔ وہ کہتا کہ میں آخر میں جب اپنا بیان دوں گا تو تم سب حیران رہ جاؤ گے مگر اس نے سزائے موت لے کر اعلان کر دیا کہ وہ اپیل نہیں کرے گا۔ رفعت کے باپ نے ایک تجربہ کار وکیل سے اپیل دائر کرائی لیکن بیکار گئی۔ ہائی کورٹ نے سزا بحال رکھی۔ پھر پھانسی کی تاریخ مقرر ہو گئی اور وسیم خان کو پھانسی دے دی گئی۔

قتل کا یہ کیس اُن ہزارہا کیسوں میں سے ایک تھا جو ہر تھانے میں آتے اور عدالتوں میں جاتے تھے۔ کوئی بری ہو جاتا اور بہت سے سزائے موت یا عمر قید پا جاتے۔ یہ تو پولیس کا معمول ہوتا ہے، کیس آیا، ختم ہوا، ہمارے ذہن سے اُتر گیا اور ہم دوسرے کیس کی تفتیش میں مصروف ہو گئے لیکن وسیم خان میرے ذہن سے نہ اُترا۔ وہ مجھے کئی بار یاد آیا اور میں نے اپنے آپ میں

بے چینی سی محسوس کی۔ ایک معزز اور شگفتہ مزاج آدمی جیسے ہنستا کھیلتا آیا اور پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں اسے بھول نہ سکا۔

چار سال بعد میں سی آئی اے میں تھا۔ مسلم لیگ کا تاریخی جلسہ دلّی میں ہوا۔ قائداعظمؒ کی تقریر تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کا بیشتر عملہ عام شہری کپڑوں میں جلسے میں ڈیوٹی پر تھا۔ میں بھی اس جلسے میں ڈیوٹی پر ہی شریک ہوا۔ لاہور والے ۱۹۴۰ء کے جلسے کے بعد جس میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی، دلّی کا یہ جلسہ یادگار تھا جس میں مسلمانوں نے انگریزی حکومت اور ہندوؤں کی کانگرس کو بتا دیا کہ وہ پاکستان سے کم کچھ بھی قبول نہیں کریں گے۔

اس جلسے میں مجھے رشید نظر آیا، وہ کالج سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مسلم لیگ کا بیج لگا رکھا تھا اور بڑے جوش و خروش سے بھاگ دوڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ کہنے لگا۔ "آپ نے اچھا کیا کہ وردی میں جلسے میں نہیں آئے"۔ میں ہنس پڑا۔ میرے دل میں آئی کہ اس سے پوچھوں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ میں اس سے وسیم خان کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ بہت مصروف تھا۔ قائداعظمؒ تشریف لانے والے تھے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

# اصل قاتل پاکستان میں ملا

اس سے چند ہی دنوں بعد مجھے کرنل آبدار اور ابرار کی لاشوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹیں دے کر تفتیش پر لگا دیا گیا۔ یہ کیس آپ کو اپنی کتاب کا ر، شلوار، اور دوپٹہ" میں سنا چکا ہوں۔ اس کا عنوان تھا "وہی سیڑھیاں وہی زہر"۔ اس کے بعد چند اور کیس آئے پھر دنیا ہی بدل

گئی۔ مسلمانوں نے پاکستان لے کے دم لیا۔ میں بھی پاکستان میں آگیا۔ سرکاری طور پر مجھے بوڑھا قرار دے کر پنشن دے دی گئی۔ مجھے ہندوستان میں زمین کے بدلے پاکستان میں کافی اراضی مل گئی اور میں کاشتکار بن گیا۔

۱۹۶۲ء کا ذکر ہے کہ میں شہر گیا تو رشید مل گیا۔ میں اسے پہچان نہ سکا۔ میں نے اسے بیس سال کی عمر میں دیکھا تھا جب وہ میری نظر میں بچہ تھا۔ اب اس کی عمر چالیس سال تھی۔ چہرے پر پختہ عمر کے آثار تھے۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ مجھے وسیم خان یاد آگیا۔ اور بیس سال پرانا کیس میرے ذہن میں کل رات کی بات کی طرح تازہ ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ خدا نے مجھے بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ اب اس سے وسیم خان کے متعلق باتیں کروں گا۔

پہلے تو رشید کے ساتھ رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ معلوم ہوا کہ اس کے پاس تین مربع زمین ہے لیکن توجہ نہ ملنے کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ اب وہ زمین کی طرف ذاتی توجہ دینا چاہتا تھا۔ وہ شہر سے ٹیوب ویل خریدنے آیا تھا۔ میں اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اس نے اپنی اراضی کے متعلق مسائل مجھے بتائے۔ مجھے زراعت سے اتنا لگاؤ تھا کہ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے کبھی اپنی اراضی پر لے چلے پھر میں اسے بتاؤں گا کہ وہاں کیا کرنا چاہیئے اور ٹیوب ویل کی ضرورت ہے یا نہیں۔

ہوٹل میں ہم اراضی اور زراعت کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم اگلی ملاقات کا پروگرام طے کر کے جدا ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق میں چند دنوں بعد اس کے ہاں گیا۔ وہاں سے اس کی اراضی پر جانا تھا جو وہاں سے اسّی نوّے میل دور تھی۔ میں اس کے گھر گیا۔ بہت خوبصورت کوٹھی تھی۔ اس کی بیوی ڈرائینگ روم میں آگئی۔ اسے دیکھا تو میں بُری طرح بدک گیا۔ میری آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ رفعت تھی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی لیکن مجھے

ابھی تک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی لگتی تھی۔ بیس برسوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کی خاطر ایک نوجوان لڑکا قتل ہوا اور ایک معزز آدمی پھانسی چڑھ گیا تھا۔

میں اسے اسلام علیکم کہنا بھی بھول گیا۔ اس نے مسکرا کر اسلام علیکم کہی تو میں حیرت سے بیدار ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رشید نے اسے بتایا نہیں تھا کہ میں آ رہا ہوں یا میں وہی انسپکٹر ہوں جس نے وسیم خان کو پھانسی چڑھوایا تھا۔ اس نے مجھے پہچانا نہیں۔

رشید نے کہا۔ "تم نے پہچانا نہیں رفعت؟ انسپکٹر احمد یار خان ہیں یہ۔ وسیم خان کے کیس والے"۔

رفعت کے منہ سے آہ کی طرح نکلا۔۔۔ "اوہ"۔۔۔ اور اس کا اتنا اچھا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں بے چینی سے حرکت کرنے لگیں۔ اس نے رشید سے کہا۔ "آپ بیٹھیں"۔۔۔ اور وہ اٹھ کر بہت تیز تیز قدم اٹھاتی ڈرائینگ روم سے نکل گئی۔ رشید بھی پریشان ہو گیا۔ وہ تو جیسے میری موجودگی کو ہی بھول گیا تھا۔ وہ بھی اٹھا اور اندر چلا گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد رشید واپس آیا تو میں نے پوچھا کہ کیا ہو گیا تھا، رفعت کو کوئی تکلیف ہو گئی ہے؟

"مجھ سے ایک بھول ہو گئی تھی"۔ اس نے گھبرائے گھبرائے لہجے میں جواب دیا۔ "میں بھول گیا تھا۔ مجھے آپ کو رفعت کے سامنے نہیں لانا چاہیئے تھا۔ اس نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو تعارف کرا دیا"۔

"میں سمجھ گیا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ مجھے وسیم خان کا قاتل سمجھتی ہو گی"۔

"نہیں"۔ رشید نے کہا۔ "آپ کے خلاف اسے کوئی شکایت نہیں۔ آپ کو دیکھ کر اسے

وسیم خان یاد آگیا ہے ..... وسیم خان کے پھانسی چڑھنے کے بعد رفعت تقریباً پاگل ہو گئی تھی۔ وسیم خان کی لاش ہم نے ہی دفن کی تھی۔ اس کا اور کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ رفعت نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے ہم کئی بار وسیم خان کی قبر سے اُٹھا کر لائے تھے۔ تین چار بار وہ رات کو غائب ہو گئی تھی اور ہر بار وسیم خان کی قبر پر بیٹھی ہوئی ملی۔ ہماری منگنی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ شادی کر دی جائے تاکہ رفعت کی توجہ تقسیم ہو جائے ....

"شادی کر کے بھی رفعت ٹھیک نہ ہوئی۔ شادی ۱۹۴۳ء میں ہو گئی تھی۔ پہلے تو ڈاکٹر علاج کرتے رہے پھر انگریز ماہرِ نفسیات کا علاج شروع کرا دیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دو چار گھنٹوں کیلئے نارمل ہو جاتی تھی۔ اس دوران ایک بچہ پیدا ہوا مگر رفعت نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ پاکستان بن گیا۔ ہم ستمبر ۱۹۴۷ء میں انڈیا سے روانہ ہوئے۔ وہاں سے آنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ والد صاحب مرحوم نے ایک ٹرک کا انتظام کر لیا تھا۔ ہم پاکستان تک خیریت سے آگئے لیکن راستے میں رفعت نے سڑکوں پر اور کھیتوں میں مسلمانوں کی جو لاشیں دیکھیں انہوں نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ ان میں بچوں کی لاشیں بھی تھیں اور عورتوں کی بھی۔ وہ تو آپ نے بھی دیکھی ہوں گی۔ قدم قدم پر لاش تھی اور سڑکیں خون سے لال تھیں ....

"رفعت جب پاکستان میں داخل ہوئی تو وہ نارمل تھی۔ اس نے کہا "میں ایک وسیم کو روتی تھی یہاں تو میرے لاکھوں وسیم قتل ہو گئے ہیں" یہ ایسا صدمہ تھا جس نے اسے نارمل کر دیا۔ پھر وہ ٹھیک رہی۔ اگر کسی نے گھر میں وسیم خان کا نام لے لیا تو رفعت کی یہی حالت ہو جاتی تھی جو آج ہوئی ہے۔ ہم سب محتاط ہو گئے۔ پھر والد صاحب بھی فوت ہو گئے اور امی جان بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ رفعت کے والدین بھی فوت ہو چکے ہیں۔ اب ہم ہیں اور ہمارے بچے ہیں۔ ایک مدت گزر گئی ہے کہ گھر میں وسیم خان کا نام کسی نے نہیں لیا تھا۔ آج آپ کو دیکھ کر رفعت

کو وسیم خان یاد آگیا ہے..... سنبھل جائے گی۔ میں اسے ایک گولی کھلا آیا ہوں"۔

"ہاں رشید صاحب"۔ میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "رفعت کو اتنا ہی جذباتی ہونا چاہیئے تھا۔ وسیم خان اسی کی عزت کی خاطر پھانسی چڑھا تھا"۔

"نہیں"۔ رشید نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ جانے کیا سوچنے لگا۔ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔۔۔ "رفعت کی اس ذہنی کیفیت کی وجہ کچھ اور ہے"۔۔۔ جب رشید نے وجہ بتائی تو مجھے اس طرح دھکا لگا جیسے میرے قریب بم پھٹا ہو۔ اس نے کہا۔۔۔ "وسیم خان بے گناہ پھانسی چڑھ گیا تھا"۔

"بے گناہ؟" میں نے صوفے سے اچھل کر پوچھا۔۔۔ "کیا اُس نے اس لڑکے کو قتل نہیں کیا تھا؟"

"نہیں"۔ رشید نے کہا۔۔۔ "اُس لڑکے کو میں نے قتل کیا تھا۔ وسیم خان نے میرے گلے سے پھندا اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا تھا.... کسی وقت آپ کو پوری کہانی سناؤں گا"۔

# راز بیس برس بعد کھُلا

میں وہ رات ان کے ہاں ٹھہرا۔ دوسرے روز رشید مجھے اپنی کار میں اپنی اراضی پر لے گیا۔ میں نے اراضی کی حالت دیکھ کر اسے کئی ایک مشورے دیئے۔ کچھ کام وہیں کے مزارعوں سے شروع کرا دیئے۔ اس کے بعد میں اپنے چک میں آگیا۔ اپنے دو تجربہ کار اور ذہین مزارعے رشید کو دے دیئے۔ کئی بار شہر گیا۔ رشید سے ملا۔ اسے ساتھ لیا اور اس کی اراضی پر گئے۔

تین مہینے صرف کر کے میں نے رشید کے تقریباً تمام زرعی مسائل حل کر دیئے۔ ان تین مہینوں

پس میں ان کے ہاں تین تین دن بھی رہا۔ رفعت میرے ساتھ بے تکلف ہوگئی۔ اس نے مجھے ذہنی طور پر یہاں تک قبول کرلیا کہ اس کا وہ ردِ عمل نہ ہوا جو مجھے پہلے روز دیکھ کر ہوا تھا۔ پھر اس میں یہ تبدیلی بھی آئی کہ میرے پاس بیٹھ کر وسیم خان کی باتیں کرنے لگی۔ میں نے کرید کرید کر اس سے ساری باتیں سن لیں۔ رشید نے بھی مجھے ساری بات سنا دی اور اس طرح جو کہانی میرے سامنے آئی وہ جذبۂ ایثار کی ایک غیر معمولی مثال ہے۔ میں یہ کہانی اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

رفعت امیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کا خاندان ہندوستان کے اسی شہر کا رہنے والا تھا جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی۔ رشید بھی امیر کبیر گھرانے کا فرد ہے۔ وہ اس شہر سے کچھ دور ایک قصبے کا رہنے والا تھا۔ اس شہر میں کالج میں پڑھتا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ رفعت لڑکیوں کے کالج میں پڑھتی تھی۔ رفعت سیکنڈ ایئر میں تھی، رشید تھرڈ ایئر میں۔ کسی طرح ان کا تعارف ہوگیا۔ پھر دونوں کی ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ دونوں آزاد خیال امیر گھرانے کے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کھلے بندوں ملتے رہے۔ رفعت ہوسٹل میں اس کے کمرے میں بھی جاتی رہی۔ دونوں جذباتی تھے۔ عمر ہی ایسی تھی۔ رفعت نے اپنی ماں سے رشید کا ذکر کیا۔ ماں نے اسے کہا کہ وہ رشید کو گھر لائے۔ رشید ان کے گھر گیا تو رفعت کی ماں کو وہ اچھا لگا۔ پھر اس کا تعارف رفعت کے والد صاحب سے ہوا۔ اس کے بعد رشید رفعت کے گھر آنے جانے لگا۔

چھٹیوں میں رشید اپنے گھر گیا تو رفعت اور اس کے خاندان کا ذکر اپنے والدین سے کیا۔ اس کے والد صاحب شہر میں آئے تو رشید انہیں رفعت کے گھر لے گیا۔ دونوں کے والد صاحبان ایک دوسرے میں گھل مل گئے۔ پھر ان کی ملاقاتیں شروع ہوگئیں اور رشید اور رفعت کی منگنی ہوگئی۔ دونوں کالج میں پڑھتے رہے۔

ایک روز رفعت رشید کے ہوسٹل میں گئی اور اسے کہا کہ دریا کے کنارے چلتے ہیں۔

رشید اسے دریا پہ لے گیا۔ تھوڑی دیر کشتی کی سیر کی پھر دریا کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے ذرا دور نکل گئے اور پھوار پڑنے لگی۔ وہ درختوں کے نیچے جا کھڑے ہوتے۔ قریب ہی کہیں سے انہیں کسی کے گانے کی دھیمی دھیمی اور بڑی ہی سریلی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھے کہ کوئی ملاح یا ماہی گیر ہوگا۔ وہ اس طرف چلے گئے۔ وہاں قدرتی بیلوں نے دو تین درختوں پر چڑھ کر ایک کمرہ سا بنا رکھا تھا۔ وہاں ایک خوش وضع اور خوش پوش آدمی کھڑا گا رہا تھا۔ رشید اور رفعت جھینپ گئے اور گانے والا چپ ہو کر مسکرایا۔ اس نے کہا۔ "یہیں آجائیں۔ میں بھی پھوار سے چھپا کھڑا ہوں ...... آپ دونوں سٹوڈنٹ ہیں؟"

رفعت نے اپنا اور رشید کا تعارف کرایا۔ اور اس آدمی نے اپنا نام وسیم خان بتایا۔

رفعت کہتی ہے کہ جب وسیم خان اور اس کی آنکھیں آمنے سامنے ملیں تو وسیم خان کی مسکراہٹ یکلخت غائب ہوگئی اور اس کا چہرہ اس طرح اداس ہو گیا جیسے چاند پر بادل آگیا ہو۔ یہ تبدیلی اتنی نمایاں تھی کہ رفعت پریشان سی ہوگئی۔ وسیم خان نے اس سے پوچھا ——

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

رفعت نے اسے بتایا۔ وسیم خان گہری سوچ میں کھو گیا۔ رشید نے یہ کہانی سناتے ہوئے اپنے اُس وقت کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے —— "وسیم خان رفعت کو دیکھتے ہی سنجیدہ ہو گیا اور میں سمجھا کہ یہ رفعت کی خوبصورتی کا اثر ہے۔ اسے جو کوئی دیکھتا ہے کچھ دیر دیکھتا ہی رہتا ہے۔ وسیم خان کے متعلق بھی میں نے ایسی ہی رائے قائم کی۔ اسے تو جیسے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ وہ صرف رفعت سے اس کے خاندان اور حسب نسب کے متعلق پوچھتا رہا۔

رفعت نے جب اپنے والد صاحب کا نام بتایا تو وسیم خان کے منہ سے آہ سی نکل گئی۔ اس

کی آنکھیں قدرے سُرخ ہوگئیں۔ اس نے سر جھکا لیا اور وہ ٹہلتے ٹہلتے اوٹ سے نکل کر پھوار میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے رفعت سے آہستہ سے کہا "شاعر معلوم ہوتا ہے" لیکن وہ اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔"

وسیم خان پھوار میں چلا گیا تھا۔ رشید اور رفعت کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ وہ اچانک پیچھے کو گھوما۔ اب وہ پہلے کی طرح مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "یہ پھوار بہت اچھی لگتی ہے۔ دیکھو بچو۔ اس پھوار سے چھپو نہیں۔ گھومو پھرو"۔ پھر اس نے رشید سے کہا۔ "اگر میری پہلی بیٹی زندہ ہوتی تو رفعت کی طرح ہوتی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی بچی یاد آگئی تھی"۔

رشید نے اس کے متعلق اپنی رائے بدل لی۔ وہ اسے جوان سال آدمی سمجھا تھا مگر وہ چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی عمر کا تھا۔ اس کی شگفتگی عود کر آئی اور اس نے کچھ ایسی پیاری باتیں کیں کہ رفعت اور رشید اس سے بہت متاثر ہوئے۔ رفعت کے کہنے کے مطابق، اس نے جو تاثر قبول کیا وہ غیر معمولی تھا اور اس کا تعلق براہِ راست جذبات سے تھا۔ ان دونوں کی فرمائش پر وسیم خان نے انہیں دو گیت اور ایک غزل سنائی۔ اس شام وہ بہت دیر تک وسیم خان کیساتھ رہے۔ وہ ان کے ساتھ بچوں کی طرح ہنستا کھیلتا رہا۔ پھر وہ اکٹھے واپس گئے۔

دو تین روز بعد رشید اور رفعت اس کے گھر گئے۔ وسیم خان نے ان کا اپنی بیوی سے تعارف کرایا۔ وسیم خان کی بیوی سانولے سے رنگ کی عورت تھی جس کے نقش و نگار میں بڑی کشش تھی۔ معلوم ہُوا کہ وسیم خان کے تین بچے پیدا ہوئے تھے۔ تینوں باری باری بچپن میں ہی مر گئے۔ وسیم خان کی بیوی کو بچوں کا بہت غم تھا۔ انہیں یاد کر کے روتی تھی۔ یہی غم وسیم خان کے دل کو بھی جلا رہا تھا لیکن اس نے غم کو مسکراہٹوں، قہقہوں اور لطیفوں میں چھپا لیا تھا۔ البتہ وہ جب گاتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز غم اور سوز میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اس روز کے بعد رفعت کا یہ معمول بن گیا کہ تیسرے چوتھے روز وسیم خان کے گھر چلی جاتی۔ وہ یہ غلطی کرتی رہی کہ وسیم خان کی بیوی کے پاس بیٹھنے کی بجائے زیادہ دیر وسیم خان کے پاس بیٹھی رہتی۔ رفعت نے مجھے بتایا کہ وسیم خان اسے دیکھتا تھا تو اس پر کوئی ایسی ذہنی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جسے وہ آج بھی بیان نہیں کرسکتی۔ ان میں ہمراز دوستوں والی بے تکلفی بھی پیدا ہو گئی اور رفعت عمر کا فرق بھول گئی۔ وہ وسیم خان کے پاس بیٹھ کر روحانی سکون محسوس کرتی تھی۔

کبھی کبھی رشید بھی وسیم خان کے گھر جاتا تھا۔ ایک مہینے بعد کچھ ناگواریاں پیدا ہونے لگیں۔ رشید رفعت اور وسیم خان کی بے تکلفی کو ناپسند کرنے لگا۔ وہ آخر اس کی منگیتر تھی۔ وسیم خان کی بیوی بھی شکوک میں مبتلا ہو گئی۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وسیم خان اور اس کی بیوی کی آپس میں اس بات پر کبھی لڑائی ہوئی تھی یا نہیں، البتہ رشید اور رفعت کی آپس میں جھک جھک ہونے لگی۔ رفعت نے وسیم خان کو بتا دیا کہ رشید اس سے بدظن ہوتا جا رہا ہے۔ وسیم خان نے رشید کو سمجھایا کہ اس کی عمر بیالیس سال ہے اور رفعت کی عمر ابھی بیس سال بھی نہیں ہوئی۔ یہ تو باپ بیٹی کا رشتہ ہے۔ رشید نے اسے صاف لفظوں میں کہا کہ بیشک وہ بیالیس سال کا ہے لیکن اس میں اتنی شگفتگی اور اتنی زندگی ہے کہ رفعت عمر کو نظر انداز کر چکی ہے۔ وسیم خان نے اس کا شک رفع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن رشید بدظن رہا اور بدظن ہی ہوتا چلا گیا۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ ایک روز وسیم خان کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ اس کی بیوی مر گئی ہے۔ اسے دل کے مقام پر درد اٹھا۔ ڈاکٹر فوراً آ گیا لیکن مریضہ بچ نہ سکی۔ یہ دل کے مرض کا حملہ تھا جو اچانک ہوا۔ رشید اور رفعت نے وسیم خان کو پہلی بار روتے دیکھا اور

وہ بھی اس طرح جیسے دُودھ پیتا بچہ بھوک سے رو رہا ہو۔

رفعت جذباتی طور پر وسیم خان کی غلام ہو گئی تھی۔ وہ اب پہلے سے زیادہ اس کے گھر جانے لگی۔ شام کو جاتی تھی۔ وسیم نے کھانا پکانے کے لیے خانساماں رکھ لیا تھا۔ رفعت کبھی کبھی اسے اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاتی۔ اس کے دل میں رشید کی جو محبت تھی اُس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وسیم خان کے ساتھ بھی اسے محبت ہی تھی لیکن اس کا رنگ کچھ اور تھا جسے رفعت نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ــــ "وہ میرا پیر اور مُرشد تھا، میرا بھائی تھا، میرا بیٹا تھا اور میرا ہمراز دوست تھا"...... رفعت نے یہ بات سناتے ہوئے رشید کے سامنے بے باکی سے کہا۔ "اور اگر وہ مجھے یہ کہہ بیٹھتا کہ رفعت، مَیں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میں کبھی انکار نہ کرتی"۔

## ایک بھید ایک غلط فہمی

وسیم خان نے بیوی کے صدمے کو برداشت کرنے کی بہت کوشش کی۔ پہلے سے زیادہ ہنسنے اور گنگنانے لگا مگر رفعت کے سامنے کئی بار رو پڑا۔ اس نے رفعت کو بتایا کہ وہ بعض راتیں سو نہیں سکتا اور دریا کے کنارے ٹہلنے نکل جاتا ہے۔ ایک بار رفعت نے اسے کہہ ہی دیا ــــ "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں باجی کی جگہ لے سکتی ہُوں تو میں حاضر ہوں"۔

وسیم خان نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا ــــ "یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے دلی مسرت اُس روز ہو گی جس روز رشید تمہیں ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا۔ تمہارا آدھا جہیز تو میرے ذمے ہے۔ جب تمہاری شادی کا دن مقرر ہو جائے گا تو تم سے اور رشید سے پوچھوں گا کہ تمہارے لیے کیا کچھ بناؤں۔ میرا اب دنیا میں کون ہے"۔

رفعت نے یہ ساری باتیں رشید کو بتائیں لیکن رشید کا دل صاف نہ ہو سکا۔ رشید جذباتی اور زود رنج تھا۔ اس نے ایک روز رفعت سے یہاں تک کہہ دیا۔ "تم مجھے دھوکے میں نہ رکھو رفعت۔ تمہیں اب وسیم خان اور مجھ میں سے انتخاب کرنا ہوگا۔"

رفعت اس شام وسیم خان کے گھر گئی اور اسے یہ بات بتائی۔ وسیم خان نے رفعت کو گھر بھیج دیا اور خود رشید کے ہوسٹل میں گیا۔ رشید کے دل میں وسیم خان کے خلاف غصہ بھرا ہوا تھا لیکن وسیم خان سامنے آیا تو رشید کے آنسو نکل آئے۔ اس کا ذہن پختہ نہیں تھا۔ وسیم خان کو وہ اپنا دشمن بھی سمجھتا تھا اور دوست بھی۔ وسیم خان نے اسے پیار سے سمجھایا پھر غصے میں بھی سمجھایا۔

رشید نے اسے کہا۔ "آپ ہمارے درمیان سے ہٹ جائیں۔ رفعت کے متعلق آپ کا دل پاک ہو سکتا ہے لیکن رفعت جب آپ کی باتیں کرتی ہے تو مجھے اس کا دل صاف نظر نہیں آتا۔"

وسیم خان نے اسے جواب دیا۔ "ہاں ... کوشش کروں گا کہ تمہارے اور رفعت کے درمیان سے ہٹ جاؤں۔"

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ مقتول رفعت کے پیچھے پڑ گیا۔ چھٹی کے وقت وہ رفعت کے کالج کے باہر جا کھڑا ہوتا اور دور تک رفعت کا پیچھا کرتا۔ پھر اسے تحفے دکھانے لگا۔ کبھی گلدستے کے اس کے پیچھے چل پڑتا۔ رفعت نے رشید کو بتایا۔ رشید اس کا کلاس فیلو تھا۔ اس نے مقتول کو بتایا کہ رفعت اس کی منگیتر ہے، اسے پریشان نہ کیا کرے لیکن لڑکا ڈھیٹ تھا اور وہ بھی امیر کبیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اسی لیے ہوٹل میں رہتا تھا۔ رشید نے رفعت کی حفاظت شروع کر دی۔ وہ لڑکا پھر بھی دلیری سے رفعت کو پریشان کرتا رہا۔ دو تین بار ہاتھا پائی اور مار کٹائی تک نوبت آ گئی۔

میں نے رشید سے پوچھا "کیا آپ نے اس کی الگ پٹائی کی تھی؟ وسیم بھی تو رفعت کی حفاظت کے لیے اس کے کالج کے سامنے چلے جایا کرتے تھے۔"

"یہ غلط ہے"۔ رشید نے کہا۔ "وسیم خان کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ کوئی لڑکا رفعت کو پریشان کرتا ہے۔ کالجوں میں ایسے تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ وسیم خان نے اپنے اقبالی بیان میں جھوٹ بولا تھا کہ اس نے اس لڑکے کی پٹائی کی تھی۔ اس نے لڑکے کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔"

ایک روز مقتول نے رشید کو دھمکی دی کہ وہ اسے قتل کرا دے گا اور رفعت کو اغوا کرا لے گا۔ رشید نے اس روز بہت سوچا کہ وہ کیا کرے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ لڑکے کو شام کو ہوٹل میں ملے اور اسے دوستانہ طریقے سے سمجھائے اور اگر وہ نہیں سمجھتا تو پھر سوچا جائے گا کہ کون کسے قتل کراتا ہے۔ یہ سوچ کر رشید شام سوا آٹھ بجے ہوٹل میں گیا۔ اس نے وہاں اپنے کالج کے دو لڑکے کھانا کھاتے دیکھے۔ اس نے ان سے چھپنے کی کوشش نہ کی کیونکہ وہ قتل کی نیت سے نہیں گیا تھا۔

وہ مقتول کے کمرے میں گیا اور دوستانہ انداز میں بات شروع کی۔ مقتول نے اسے شاید رشید کی بزدلی سمجھا۔ اس نے طنزیہ باتیں کیں۔ ترش کلامی شروع ہو گئی۔ رشید بھڑک اٹھا۔ مقتول نے میز کا دراز کھولا اور اس میں سے چاقو نکال لیا۔ وہ چاقو کھول رہا تھا کہ رشید نے اسے باکسروں کی طرح سیدھا گھونسہ پوری طاقت سے مارا جو مقتول کو کان کے نیچے گردن پر لگا۔ مقتول کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ تین چار قدم پرے جا گرا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

رشید نے نہایت پھرتی سے چاقو اٹھا لیا۔ مقتول بہت تیزی سے اٹھا اور جھک کر رشید کی طرف دوڑا۔ رشید چاقو اٹھا کر ابھی سیدھا نہیں ہوا تھا رشید نے نیچے سے چاقو کا وار کیا۔ اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا۔ اگر مقتول نے کوٹ اور سویٹر پہنا ہوا ہوتا تو چاقو بڑی مشکل سے کھال تک پہنچ سکتا۔ اس نے کرتہ پہن رکھا تھا۔ چاقو کی نوک کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ادھر

سے مقتول جھکا ہوا اتنی تیزی سے آیا کہ رکنے کی بجائے بے قابو ہو کر آگے کو ہی آ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِدھر رشید کا وار اُدھر سے مقتول جھکا ہوا تیز رفتار آیا۔ چاقو اتفاق سے دل پر لگا اور دل میں اُتر گیا۔

مقتول نے چیخ ماری اور اس کے منہ سے بڑی زور سے "ہائے - آہ" نکلی۔ رشید نے چاقو کھینچ لیا۔ مقتول پیٹ کے بل گر پڑا۔ ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک بیرا ہاتھ میں ٹرے اٹھائے اندر آ گیا۔ یہ سب کچھ دو تین سیکنڈ میں ہو گیا۔ رشید نے چاقو پھینکا اور بیرے کو دھکا دے کر باہر کو دوڑ پڑا۔ بیرے نے شور مچا دیا "قتل ہو گیا۔ لڑکا مارا گیا"۔

رشید کھانے کے ہال والی سیڑھیوں سے اترنے کی بجائے پچھواڑے کی سیڑھیوں کی طرف گیا۔ وہ بہت تیزی سے اترا اور آخری سیڑھی سے گر پڑا۔ اُدھر سے ایک آدمی شور سُن کر اس کی طرف دوڑا۔ اس نے بھی "پکڑو۔ پکڑو" کا شور مچایا۔ رشید اٹھ کر دوڑ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ اندھیری گلیوں میں چلتا اور سوچتا رہا کہ کہاں جائے۔ رفعت کے گھر کا خیال آیا تو اس نے سوچا کہ اس کے والد صاحب بگڑ نہ جائیں کہ تم قاتل ہو۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ اسے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے انسانوں سے ڈر آنے لگا۔ ایک جگہ اسے ایک پولیس کانسٹیبل نظر آیا تو اس نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا۔ وہ اب پناہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ایسی آوازیں گونجنے لگیں جیسے بہت سے لوگ اس کے تعاقب میں دوڑے آ رہے ہوں۔ اس سے وہ اور زیادہ گھبرا گیا۔ سڑک پر جا کر وہ تانگے میں بیٹھا اور وسیم خان کے گھر چلا گیا۔

اس نے وسیم خان کو سارا واقعہ اور مقتول کی رفعت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ وغیرہ سنا دی۔ وسیم خان نے اس کی پتلون دیکھی۔ گھٹنوں پر رگڑ کے نشان تھے۔ اس کے کوٹ، پتلون اور قمیض کو اچھی طرح دیکھا۔ کوٹ کی دائیں آستین اور قمیض کی آستین کے کف پر جو کوٹ سے ذرا با

تھا، خون کے قطرے لگے ہوئے تھے۔

وسیم خان نے اسے تانگے میں بٹھایا اور اسے تسلی دلاسہ دیتا ہوا اسے اس کے ہوسٹل کے کمرے میں لے گیا۔ اس کا سوٹ اور قمیض اتروا کر اسے کہا کہ وہ سلیپنگ سوٹ پہن لے۔ اس کا کوٹ، پتلون اور قمیض وسیم نے ایک میز پوش میں لپیٹ لیے۔ پھر اس سے کہا کہ وہ ہوٹل میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر ہوٹل سے بھاگنے تک کی ایک ایک تفصیل بتائے اور یہ بھی بتائے کہ اسے کسی جان پہچان والے نے وہاں دیکھا تھا یا نہیں۔

رشید نے اسے تمام تفصیلات بتا دیں۔ یہ وہی تفصیلات تھیں جو وسیم خان نے اقبالِ جرم میں بیان کی تھیں اور دوسرے گواہوں نے تصدیق کی تھی۔ وسیم خان نے پولیس والوں کی طرح سوال کر کر کے کچھ اور باتیں بھی اس سے معلوم کر لیں۔ وہ تجربہ کار اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے رشید کو یقین دلایا کہ ہو سکتا ہے اسے گرفتار کر لیا جائے لیکن اسے سزا نہیں مل سکتی۔ اس نے رشید کو اس طرح کی ہدایات دیں ـــ "اگر کالج کے ان دو لڑکوں نے جو ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے پولیس کو بتا دیا کہ رشید ہوٹل کی بالائی منزل میں گیا تھا تو ہو سکتا ہے پولیس تمہیں رات کو یا صبح تھانے لے جائے۔ وہ بیرا خطرناک گواہ ہے جس نے تمہیں چاقو ہاتھ میں پکڑے مقتول کی لاش کے کمرے میں کھڑے دیکھا تھا۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ پولیس اپنی کارروائی میں بہت وقت لگائے گی۔ اگر تمہیں تھانے لے جایا گیا تو میں تھانے میں پہنچ جاؤں گا۔ تم جرم سے انکار کرتے رہنا۔ میں تھانے میں آ کر کہوں گا کہ لڑکے کو میں نے قتل کیا ہے۔ تم بالکل خاموش رہنا اور یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں پولیس کو دھوکے میں ڈال دوں گا۔ تمہارے بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔ تمہیں الزام سے خارج کرا کے میں اپنا بچاؤ خود کر لوں گا۔"

# اتنی قربانی؟ ایسا ایثار؟

اُس وقت رشید کی جذباتی حالت ایسی تھی کہ وسیم خان اسے جو کچھ کہتا رہا وہ تسلیم کرتا رہا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ وسیم خان نے اس کے کپڑے جو اُس نے میز پوش میں لپیٹے تھے، اُٹھائے اور جب وہ چلنے لگا تو رشید ڈرے ہوئے بچے کی طرح اس کے ساتھ لپٹ گیا اور رو پڑا۔ کہنے لگا۔ ”آپ نہ جائیں۔ یہیں رہیں یا مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔“

وسیم خان نے اسے سمجھایا کہ اس کا اب کمرے سے غیر حاضر ہونا مناسب نہیں۔ وہ حوصلہ مضبوط رکھے اور اگر پولیس آجائے تو پوری دلیری سے واردات سے لاعلمی کا اظہار کرے۔ وسیم خان اس کے واردات کے وقت کے کپڑے لے کر چلا گیا۔ پھر وسیم خان کہاں کہاں گیا رشید کو کچھ بھی معلوم نہیں۔

وسیم خان کے جانے کے تین ساڑھے تین گھنٹوں بعد میں رشید کے کمرے میں گیا۔ میرے ساتھ اس کے ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ یہ چند گھنٹے رشید کے لیے قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ اگر وسیم خان اسے ہدایات نہ دے گیا ہوتا تو رشید بھاگ جاتا اور جب مفرور ملزم کی حیثیت سے پکڑا جاتا تو یہ کہانی جو مجھے ۱۹۶۲ء میں سنائی گئی ۱۹۴۲ء میں پھانسی کے تختے پر ہی ختم ہو جاتی۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر وسیم خان اپنے آپ کو پیش نہ کر دیتا تو رشید کو یقیناً سزائے موت ہو جاتی یا سیشن جج اس کی کم عمری پر رحم کرتے ہوئے عمر قید کی سزا دیتا لیکن اُس انگریز سیشن جج سے رحم کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

رشید نے وسیم خان کو بتانے میں دیکھا جب میں رشید کو اقبالِ جرم کے عین کنارے پر

لے آیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ رشید کو میں نے خارج از تفتیش کر دیا تو وہ رفعت کے گھر گیا اور اسے ساری واردات سنائی۔ رفعت کے والد صاحب بھی جاگ اُٹھے۔ رشید نے انہیں بھی بتایا کہ اس کا ایک کلاس فیلو اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے اور وسیم خان نے ڈرامہ کھیلا ہے۔ رفعت کے والد صاحب پریشان ہو گئے۔ وہ وسیم خان کو نہیں جانتے تھے۔ رشید اور رفعت نے انہیں بتایا کہ وہ کون ہے اور ان کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے۔

والد صاحب بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وسیم خان خلوص اور ایثار کا پیکر ہے ورنہ کسی کی خاطر کون اتنا خطرہ مول لیتا ہے۔ وہ اُسی وقت پولیس سٹیشن گئے۔ آگے میں تھا۔ میں ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ میں نے انہیں وسیم خان سے ملنے کی اجازت نہیں دی کیوں کہ مجھے ابھی وسیم خان کا اقبالی بیان مجسٹریٹ کے سامنے لے جا کر قلمبند کرانا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ چار پانچ دنوں تک وسیم خان کو جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے گا۔ وہاں آپ اسے آسانی سے مل سکتے ہیں۔

میں نے چھٹے روز اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ وسیم خان کا اقبالِ جرم قلمبند ہوا اور اسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ رفعت کے والد صاحب رسوخ والے تھے۔ انہوں نے وسیم خان کو سے ملاقات کی۔ وہ ایک وکیل بھی ساتھ لے گئے تھے۔ رفعت اور رشید بھی ساتھ تھے۔ یہ رفعت کے والد صاحب اور وسیم خان کی پہلی ملاقات تھی۔

رفعت نے مجھے سنایا۔ "ہم جیل کے اندر گئے اور ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وسیم خان کمرے میں داخل ہوا۔ میں اور رشید اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ابّا جان سے کہا کہ یہ ہیں وسیم خان۔ ابّا جان نے وسیم خان کو دیکھا تو ان کا منہ اور آنکھیں

حیرت سے کھل گئیں۔ وسیم خان مسکرا رہے تھے۔ ابّا جان کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو۔
انہوں نے کہا۔ وسیم، تم؟......

"وسیم خان نے مسکرا کر جواب دیا۔ زندگی کا سفر عجیب ہے۔ بچھڑے ہوئے مسافر کسی نہ کسی منزل، کسی نہ کسی موڑ پر مل ہی جاتے ہیں۔" وسیم خان ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے اور ان کی یہی باتیں مجھے بہت پسند تھیں۔ وسیم خان نے ابّا جان کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ابّا جان نے ہاتھ ملانے کی بجائے وسیم خان کو بازوؤں میں لے لیا اور کتنی ہی دیر دونوں ایک دوسرے کے سینے سے لگے رہے۔ بہت مختصر باتیں ہوئیں۔ میں سوچتی رہی، کیا ابّا جان اور وسیم خان ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟....

"ان کے درمیان کیس کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ وکیل نے انہیں بتایا کہ وہ جب سیشن کورٹ میں جائیں تو اقبالی بیان سے منحرف ہو جائیں اور بیان دیں کہ پولیس نے تشدّد سے بیان لیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وسیم خان وکیل اور ابّا جان کی باتوں کو پورے دھیان سے سُن ہی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے ہم سب کو یہ کہہ کر بے فکر رہنے کو کہا کہ میں نے رشید کو بچانے کے لیے پولیس کو گمراہ کیا ہے۔ پولیس خوش ہے کہ میں نے اقبالِ جرم کر کے شہادت اور ثبوت بھی مہیا کیے ہیں لیکن میں آخر میں جو بیان دوں گا، وہ آپ سب کو حیران کر دے گا۔ میں بری ہو جاؤں گا۔ وکیل نے انہیں کہا۔ وسیم صاحب! آپ نے ان بچوں کی خاطر ایثار کیا ہے لیکن یہ خیال رکھیے گا کہ قانون آگ ہوتی ہے۔ اس سے کھیلنا بڑا خطرناک ہے عدالت میں میری ہدایات کو نظر انداز نہ کیجئے گا۔ مجھے سیشن کورٹ کا خطرہ نظر آ رہا ہے۔"

وسیم خان خوش تھا جیسے قتل کا جرم اپنے سر لے کر قید ہو جانا کوئی بات ہی نہیں۔ اس نے سب کو یقین دلایا کہ اس نے جو ڈرامہ کھیلا ہے، اس کا انجام اچھا ہو گا۔

رفعت نے مجھے سنایا۔ "ہم گھر آگئے۔ ابّا جان نے مجھ سے پوچھا کہ وسیم خان سے میری ملاقات کس طرح ہوئی تھی۔ میں انہیں پہلے بھی بتا چکی تھی۔ ایک بار پھر بتا دیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "وسیم نے تم سے میرے متعلق پوچھا تھا؟" ___ میں نے جواب دیا کہ میں نے وسیم خان کو آپ کا نام بھی بتایا تھا اور امّی مرحومہ کا بھی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں۔ ابّا جان نے پوچھا ___ "وسیم خان نے میرے متعلق کوئی بات کی تھی کبھی؟" ___ میں نے جواب دیا ___ "نہیں ابّا جان ..... آپ ایسی باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا ___ "معلوم ہوتا ہے آپ وسیم خان کو پہلے سے جانتے ہیں" ....

"ابّا جان نے کہا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ آدمی ایک غیر معمولی شخصیت ہے۔ میں ابّا جان کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔ ان کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ وسیم خان کو پہلے سے جانتے ہیں۔ وسیم خان نے جیل میں انہیں دیکھتے ہی کہا تھا کہ بچھڑے ہوئے مسافر کسی منزل کسی موڑ پر مل ہی جاتے ہیں۔ میں حیران اس پر تھی کہ ایسی کوئی بات ضرور تھی جو ابّا جان نے چھپالی تھی لیکن اُن دنوں وسیم خان قید میں تھے، اس لیے ہم سب کی توجہ اور خاص طور پر میرا دھیان ان کی طرف ہی رہتا تھا۔ رات کو جب سونے کے لیے لیٹتی تھی تو دل میں آتی تھی کہ فرش پر سوؤں کیونکہ وسیم خان کا خیال آجاتا تھا کہ وہ فرش پر لیٹے ہوئے ہوں گے۔"

رشید اور رفعت نے بتایا (جو میں نے بھی دیکھا تھا) کہ وسیم خان آخر دم تک یہی کہتا رہا کہ وہ آخر میں بیان دے کر سب کو حیران کر دے گا۔ وکیل آخر دم تک مطمئن تھا مگر وسیم نے آخر میں ایسا بیان دیا کہ فی الواقع ہم سب کو حیران کر دیا۔ اپیل بھی نامنظور ہو گئی۔ آٹھویں روز وسیم خان کو پھانسی چڑھنا تھا۔ رشید، رفعت اور اس کے والد صاحب وسیم خان سے ملنے

گئے تو والد صاحب نے پوچھا — "وسیم، یہ تُو نے کیا کیا؟"
وسیم خان نے سلاخوں میں سے مسکرا کر کہا — "جو سوچا تھا وہ کر دیا" — رشید کہتا ہے کہ وسیم خان کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ شوخ اور مسرت سے بھرپور تھی۔ وہ خوش تھا اور بہت ہی خوش — رفعت اور رشید کی رو رو کر ہچکی بندھ گئی۔ رفعت کے ابا جان بھی روتے رہے اور وسیم خان سب کو ہنس ہنس کر تسلیاں دیتا رہا — اس کے بعد سب ہر روز وسیم خان سے ملنے جاتے رہے۔ ایک روز وسیم خان نے رشید سے آہستہ سے کہا "ایک دن تم اور رفعت آنا۔ ابا جان کو ساتھ نہ لانا۔"

## موت سے ایک دن پہلے

ایک روز صرف رشید اور رفعت اُسے ملنے گئے۔ پھانسی میں صرف اگلا دن باقی تھا۔ وسیم خان نے رشید سے کہا — "تم مجھے اپنا رقیب سمجھتے رہے ہو رشید... آج تمہارے دل سے سارے شکوک رفع کر دوں گا۔ تم نے ایک روز مجھے کہا تھا کہ میرے اور رفعت کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میں تمہارے سامنے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ رہا ہوں۔"

یہ سُن کر رشید کی دھاڑیں نکل گئیں۔ وسیم خان نے سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال کر رشید کے سر اور منہ پر پھیرا اور کہا — "میں تم پر طنز نہیں کر رہا رشید۔ میں نے آج تمہیں ایک کہانی سنانے کے لیے بلایا تھا۔ یہ کہانی رفعت کے لیے زیادہ دلچسپ ہو گی" — وسیم خان نے انڈیا کے ایک اور شہر کا نام لے کر کہا — "میں وہاں کا رہنے والا ہوں۔ اپنی بہت ساری زمین تھی۔ بہت بڑی حویلی تھی اور میں ماں باپ کا اکلوتا بچہ تھا۔ میں شہزادوں کی طرح بڑا ہوا۔ تمہاری

طرح شہزادوں کی طرح کالج میں پڑھتا رہا۔ کالج میں ہی تھا کہ میری شادی ہو گئی۔ وہ جاگیرداروں کے گھرانے کی بہت اچھی اور بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ ہم ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور شادی کے تیسرے مہینے میرے والد صاحب فوت ہو گئے۔۔۔۔

"میرا ایک ماموں اور دو چچے تھے۔ چچے ہماری جائداد کے پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے میری ماں کو دھمکیاں بھی دیں اور مختلف طریقوں سے پریشان کرنے لگے۔ انہوں نے مجھے غائب کر دینے کی بھی دھمکیاں دیں۔ صرف ماموں ہمارا طرفدار تھا۔ ایک روز اس کی میرے چچوں سے لڑائی ہو گئی جس میں میرا ماموں قتل ہو گیا۔ چھ مہینے بعد چچے صاف بری ہو کر آ گئے۔ میری ماں کو میرے والد صاحب کا ہی غم بہت تھا، اب اس کا سگا بھائی بھی مارا گیا۔ یہ غم اسے لے بیٹھا اور وہ مر گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میں اُس وقت تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیسے ہوا کہ تمام زمین کے مالک میرے چچے بن گئے۔ میرا زمین پر کوئی حق نہ رہا۔ میرے گھر کی شان و شوکت اسی زمین سے تھی۔ وہ نہ رہی۔ صرف حویلی اور ماں کے زیورات اور کچھ نقدی رہ گئی۔۔۔

"میں نے تعلیم جاری رکھی۔ میری بیوی نے میرا خوب ساتھ دیا۔ وہ میرے لیے جذباتی سہارا تھی۔ میرے لیے مصیبت کا وقت تو ابھی آ رہا تھا۔ میرے سسرال والے بڑے اچھے لوگ تھے مگر ان کا رویہ بدل گیا اور وہ مجھے پریشان کرنے لگے۔ کبھی طعنے دیتے کہ میں ان کی بیٹی کی ضروریات پوری نہیں کرتا۔ کبھی کہتے کہ وہ بیمار پڑ جاتی ہے تو میں اس کا علاج نہیں کرتا۔ ان کی یہ شکایت بالکل صحیح تھی کہ گھر میں اب کوئی نوکر نہیں رہا تھا۔ مجھ سے سسر اور ساس نے یہ کبھی بھی نہ پوچھا کہ وسیم، تم ماں باپ کے شہزادے تھے، اب کس طرح زندگی گزرتی ہے۔ ہمارے گھر ہی آجاؤ۔ انہیں تو یہ شکایت بھی تھی کہ میں تعلیم پر پیسہ ضائع کر رہا ہوں۔ میری بیوی میکے جاتی تو اسے ماں باپ واپس نہ آنے دیتے۔ وہ واپس آتی تو اپنے ماں باپ کو ناراض کر کے زبردستی آتی۔

سسرال اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک روز بیوی نے مجھے بتایا کہ اس کے ماں باپ کو میرے خلاف دراصل شکایت یہ ہے کہ میری اب کوئی زمین نہیں اور میں ان کی حیثیت کے مطابق نہیں رہا۔ لہٰذا وہ چاہتے یہ ہیں کہ میں بیوی کو طلاق دے دوں۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے اپنی بیٹی مجھے نہیں میری جائیداد کو دی تھی......

"میری بیوی کو پہلا بچہ ہونے والا تھا۔ دن قریب آئے تو اسے ماں آکر گھر لے گئی۔ سات آٹھ روز بعد میری بیوی نے بچی کو جنم دیا۔ مجھے سسرال والوں نے اطلاع تک نہ دی۔ کسی کی زبانی پتہ چلا۔ میں خوشی خوشی گیا لیکن مجھے اپنی بیوی تک جانے کی اجازت نہ دی گئی، نہ ہی میں اپنی بچی کو دیکھ سکا۔ میں وہاں بیٹھا رہا۔ کسی نے پانی کا گھونٹ بھی نہ پوچھا۔ میں اٹھ کر آ گیا۔ تین مہینے میری بیوی نہ آئی۔ میں بھی نہ گیا۔ وہاں اب میرے لیے صرف ذلت تھی.....

"ایک روز مجھے اپنے سسر کا پیغام ملا کہ میں بیوی کو طلاق دے دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد مجھے دھمکیاں ملنے لگیں۔ سسرال سے صاف جواب آگیا کہ وہ میری بیوی کو نہیں بھیجیں گے۔ میں اکیلا تھا اور ناتجربہ کار۔ تمہارے جتنی عمر تھی۔ میں چکرا گیا۔ ایک رات میرے گھر ڈاکہ پڑا۔ میری جان بچ گئی مگر گھر میں کچھ بھی نہ رہا۔ زیورات، نقدی اور قیمتی چیزیں نکل گئیں۔ دوسرے دن سسرال سے پیغام آیا کہ طلاق نامہ لکھ دو۔ میں نے طلاق لکھ دی....

"پولیس کو لوگوں کے زور دینے پر رپورٹ دی کہ میرے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ پولیس نے پوچھا کہ مجھے کسی پر شک ہے؟ میں جانتا تھا کہ ڈاکو میرے سسرال کے کرائے کے ڈاکو تھے۔ میں نے پولیس کو بتایا کہ مجھے کسی پر شک نہیں۔ مجھے صرف اپنی بیوی کا خیال تھا.... مگر اب میں اسے اپنی بیوی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کی دوسری شادی کر دی گئی۔ اس کا دوسرا خاوند اسی شہر کا ایک امیر زادہ تھا....

"میں اتنا دل برداشتہ ہوا کہ حویلی بیچ ڈالی۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ اچھی رقم مل گئی۔ میں اس شہر میں آ گیا اور یہ مکان خرید لیا جہاں میں رہتا تھا۔ خاصی رقم بچ گئی۔ اس سے میں نے بی۔ اے کا آخری سال پورا کیا اور ڈگری لے لی۔ نوکری کی تلاش کی تو کوئی جگہ نہ ملی۔ میں جس محکمے میں ملازم تھا اس کے سب سے بڑے افسر کے پاس چلا گیا۔ وہ انگریز تھا۔ اسے بچپن سے لے کر اس روز تک کی آپ بیتی سنا دی اور اسے کہا کہ تمہاری بادشاہی میں مجھ پر یہ ظلم ہوئے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے۔ مجھے صرف نوکری چاہیئے۔ وہ میری مصیبت کی روئیداد سے اتنا متاثر ہوا کہ مجھے نہایت اچھی نوکری دے دی۔ میں نے محنت اور دیانتداری سے کام کیا۔ دو سال بعد ایک محکمانہ امتحان پاس کر لیا۔ مجھے ترقی مل گئی۔ یہ انگریز افسر مجھ میں خصوصی دلچسپی لیتا تھا۔ چھٹے سال اس نے مجھے عہدہ بھی دے دیا......

"جو غم میں نے سہے وہ اچھے اچھے بہادروں کو پاگل کر دیتے ہیں۔ میرے اندر غم بھی تھا اور غصہ بھی۔ مجھے بڑا ہی غصیلا انسان ہونا چاہیئے تھا لیکن میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے دریا کے کنارے دور جا کر بلند آواز سے گانا شروع کر دیا۔ اور لوگ کہنے لگے دسیم زندہ دل آدمی ہے۔ بہت اچھا گاتا ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ جسے کوئی غم نہ ہو وہ زندہ دل اور گویا نہ ہو تو اور کیا ہو۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں سراپا غم ہوں اور میرا دل بُری طرح مجروح ہے۔ مجھے بیوی کی یاد آتی تھی تو میں فی الواقع تڑپنے لگتا تھا۔ میں تصوروں میں اپنی بچی سے پیار کیا کرتا تھا اور پیار کا نشہ پورا کرنے کے لیے میں ہر اُس انسان کے ساتھ محبت کرنے لگا جو کسی نہ کسی رنگ میں مظلوم تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گا...

"ایک روز ایک بیوہ کے متعلق پتہ چلا کہ دو سال پہلے تک اس کا خاوند زندہ تھا تو وہ فارغ البالی سے باپردہ زندگی گزارتی تھی۔ خاوند مر گیا تو لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی۔

اس کی ایک جوان بیٹی تھی جسے بعض لوگ عزت کی وجہ سے خراب کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ غریب تھی اس لیے کوئی اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں لڑکی کی ماں سے ملا۔ رشتہ طے کیا اور چند ایک آدمیوں کو بٹھا کر اس کی بیٹی کو بیاہ لایا۔ میں نے شادی کی خاطر شادی نہیں کی تھی، ایک لڑکی کو پناہ دی تھی۔ وہ بڑی اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ تین بچے پیدا ہوئے۔ تینوں مر گئے۔ وقت گزرتا چلا گیا اور اٹھارہ انیس سال گزر گئے ....

"پھر وہ شام آئی جب تم دونوں اچانک میری زندگی میں داخل ہوئے۔ تم دونوں شاید دیکھ نہیں سکے تھے کہ رفعت کو دیکھ کر میں چونک پڑا تھا اور میں افسردہ ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری پہلی بیوی آگئی ہے۔ نقش و نگار میں ذرہ بھر فرق نہ تھا۔ اسی عمر میں وہ میرے گھر میں آئی تھی۔ میں نے انسانوں میں اتنی مشابہت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رفعت کی شکل میری پہلی بیوی سے زیادہ ملتی تھی۔ مجھے یہ دھوکا ہوا جیسے میں اسے خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ پھر ہم میں بے تکلفی پیدا ہو گئی تو میں نے رفعت سے اس کے والد صاحب کا نام پوچھا۔ اس نے نام بتایا تو میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ میں نے اس سے اس کی امی کا نام پوچھا تو اس نے امی کا نام بھی بتایا اور یہ بھی کہ اس کی امی اس کے بچپن میں مر گئی تھی۔ میرے سارے دھوکے صحیح ثابت ہوئے۔ رفعت! تم میری پہلی بچی ہو۔"

رشید نے سنایا کہ یہ سنتے ہی رفعت کی یہ حالت ہوئی کہ وہ سلاخوں سے ٹکرائی اور ہاتھ اندر کر کے اس نے وسیم خان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جیل کا جو سنتری پاس کھڑا تھا اس نے رفعت سے کہا — "بی بی، ہاتھ باہر رکھو" — پھر وسیم خان کے ہاتھ باہر آگئے۔ باپ بیٹی ملے تو اس وقت ملے جب ان کے درمیان سلاخیں اور موت حائل ہو چکی تھی۔ رفعت کی ماں کی شادی دوسرے آدمی سے کر دی گئی تھی۔ رفعت تین چار سال کی ہوئی تو اس کی ماں مر گئی۔

اس آدمی نے دوسری شادی کی۔ دو سال بعد وہ بھی مرگئی۔ پھر اس شخص نے شادی نہیں کی۔ وہ اسی شہر میں آگیا اور یہاں کوٹھی بنائی۔ ان کی اراضی بہت تھی۔

وسیم خان نے باقی بات اس طرح سنائی۔" میں اس راز سے پردہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ میں کسی کو اپنا ماضی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ میری بیوی بھی شک میں پڑ گئی کہ میں اب افسر اور امیر ہوگیا ہوں۔ اس لیے میں امیر کبیر لڑکیوں کو پسند کرنے لگا ہوں۔ رشید کو بھی شک ہوگیا کہ میں اس کے راستے میں حائل ہوگیا ہوں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں رفعت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتا تھا۔ رفعت بیٹی! تمہیں مجھ میں جو کشش نظر آئی تھی وہ میری شگفتہ مزاجی کی وجہ سے نہیں تھی۔ یہ تو خون نے خون کو پہچان لیا تھا۔ میں خوش تھا کہ تمہاری منگنی رشید جیسے پیارے لڑکے سے ہوگئی ہے۔ میں تو تمہارے لیے آدھا جہیز تیار کر رہا تھا مگر رشید ایک لڑکے کو قتل کر بیٹھا۔ اس نے اچھا کیا کہ قتل کر کے میرے پاس آگیا اور میں نے اس سے تمام ضروری باتیں پوچھ لیں۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ میری بچی کا سہاگ اجڑ رہا ہے۔ میں رشید کو پھانسی کے تختے سے ہٹا کر وہاں خود کھڑا ہوگیا۔ وکیل کہتا تھا کہ وہ مجھے بری کرا لے گا، میں اقبالی بیان سے منحرف ہو جاؤں لیکن میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے لیے یہی موت پسند کی۔"

تحریری وصیت کے مطابق وسیم خان نے اپنا مکان رفعت کے نام کر دیا تھا اور بنک میں اس کا جو بیس ہزار روپیہ جمع تھا، وہ بھی رفعت کے نام چھوڑ گیا تھا۔ وسیم خان کی لاش رفعت کے والد صاحب لے گئے تھے اور نہایت احترام سے تجہیز و تکفین کی لیکن رفعت کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اسی حالت میں اس کی شادی رشید سے کر دی گئی۔ اس سارے واقعے کا ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ رفعت کو اپنے ابا جان سے نفرت سی ہوگئی۔ حالانکہ وہ اسے

بہت چاہتے تھے۔ وہ پاکستان میں آ کر فوت ہوئے۔ رفعت کے ساتھ ان کا پیار قائم رہا لیکن رفعت ان سے کھچی کھچی رہی۔

میں آج بھی حیران ہوں کہ وسیم خان نے یہ ڈرامہ کس خوبی سے کھیلا تھا۔ اس نے رشید کی جگہ خود پھانسی کے تختے پر کھڑا ہونے کے لیے ہر وہ شہادت اور ثبوت مہیا کیا جو استغاثہ کو قابلِ اعتماد بنانے کے لیے درکار تھا۔ اگر وسیم خان پولیس آفیسر ہوتا تو کامیاب سراغرساں ہوتا مگر وہ باپ تھا۔ اپنی بچی پر قربان ہو گیا۔

کتاب کا کور

عامر بلال

رابطہ

فیس بک

https://www.facebook.com/aamiralibilal

ٹویٹر

http://twitter.com/aamirbilal

انسٹاگرام

https://www.instagram.com/aamirbilal

یوٹیوب

https://www.youtube.com/@aamirbilal

# بال ایک چڑیل کے

میرے پاس ایک لاش ، ایک رومال ، ایک
عورت کے چند ایک بال اور زمین پر کھرُے رہ
گئے تھے۔ باقی اندھیرا تھا جس میں ایک خوبصورت
چڑیل گُم ہو گئی تھی۔

تین جوان آدمی دو دو دن کے وقفے سے قتل ہو گئے تو میرا سر چکرا گیا۔ ایک ہی بار
تین تفتیشیں سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے اور یہ مشکل صرف اُسے پیش آتی ہے جو
سچے دل سے تفتیش کرنا چاہے ورنہ آج کل ایک ایک تھانے میں ایک ایک سو قتل،
ڈکیتی، قفل شکنی اور چوری چکاری کے کیس رجسٹرڈ کیے ہوتے ہیں اور تھانے کا عملہ
اس طرح بے نیاز نظر آتا ہے جیسے اللہ نے ان کی سب مشکلیں آسان کر دی ہوں۔

قتل کی ان تین وارداتوں کی تفتیش سنانے سے پہلے مَیں آپ سے ایک نازیبا
بات پوچھنا چاہتا ہوں — "آپ حسین عورت کسے کہتے ہیں؟"
مجھے معلوم ہے آپ کا جواب کیا ہوگا — "رنگ گورا، قد بوٹا، آنکھیں موٹی موٹی،
عمر سولہ سترہ سال، زلفیں لمبی اور پیچدار، ہونٹ گلاب کی پتیاں، دانت چمکتے موتی اور
گال کشمیری سیب کی طرح" — شہروں میں حُسن کو کسی اور طرح پرکھتے ہیں۔ لڑکی بال کٹوا
کر، مٹک مٹک کر میموں کی طرح، انگریزی میں اُردو بولے اور ہر طرح سے بے حیا ہو
تو اسے "بے حد حسین" سمجھا جاتا ہے۔ دیہات والوں کا معیار ذرا مختلف ہے۔ شاعر اور

افسانہ نویس الفاظ میں جو حُسن پیش کرتے ہیں وہ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ شاید آپ نے دیکھا ہو۔ البتہ میری رائے یہ ہے کہ ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے لیکن آپ نے ایسی عورت کبھی دیکھی ہو گی یا شاید کبھی بھی نہ دیکھی ہو جسے دیکھ کر آپ بجلی کی کرنٹ کا جھٹکا محسوس کریں۔ چلتے چلتے رُک جائیں اور اس سوچ میں غرق ہو جائیں کہ اس عورت میں کیا ہے جس نے مجھے جکڑ لیا ہے۔

ایسی ایک عورت میں نے دیکھی تھی۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا۔ قد بوٹا نہیں تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی نہیں تھیں۔ عمر سولہ سترہ سال نہیں تھی۔ زُلفیں لمبی اور پیچدار نہیں تھیں۔ ہونٹ گلاب کی پتیاں نہیں تھے اور گال کشمیر کے سیب کی طرح نہیں تھے البتہ دانت چمکتے موتی ضرور تھے۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ وہ دیہاتن تھی جسے میں نے پہلی بار دیکھا تو اس نے بالوں میں کنگھی نہیں کی ہوئی تھی اور منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ اس کے جسم سے مویشیوں کے گوبر اور اپنے پسینے کی بدبُو آ رہی تھی مگر میں نے اسے دیکھا تو میری تھانیداری کانپ گئی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ شاعر اور افسانہ نویس اس عورت کو دیکھ لیتے تو اپنی نظمیں اور افسانے پھاڑ کر کوئی اور دھندا شروع کر دیتے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ بوڑھے احمد یار خان نے یہ کیا جوانوں کی طرح خرافات شروع کر دی ہے۔ مگر صاحب، وہ عورت یاد آتی ہے تو میں بہت دیر گُم سُم بیٹھا رہتا ہوں۔ دراصل مجھ جیسے جذباتی آدمی کو تھانیدار ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا ـــــ تو آؤ صاحب، آپ کو پہلے کہانی سنا دیتا ہوں پھر بتاؤں گا کہ گورے رنگ کی عورت حسین ہوتی ہے یا سانولے رنگ کی، اور حُسن ہوتا کیا ہے۔ میں حسبِ معمول اس کہانی کے اشخاص اور گاؤں کے نام فرضی استعمال کروں گا کیونکہ ہو سکتا ہے ان تین خاندانوں کے افراد پاکستان

میں موجود ہوں۔ میں گڑے مُردے اُکھاڑتے ہوئے کسی خاندان کی نشاندہی کر کے اس کی توہین کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اللہ سب کو عزت اور آبرو عطا کرے۔

وہ ہندوستان کے ایک دیہاتی علاقے کا تھانہ تھا۔ وہاں مسلمان دیہاتی، خاندانی دشمنیوں کی بنا پر، پانی لگانے کی باری پر، بیاہ شادیوں اور رشتے ناطوں کی ناچاقیوں پر ایک دوسرے کا خون بہاتے رہتے تھے۔ اس زمرے میں قتل کی جو وارداتیں ہوتی تھیں ان کی تفتیش میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اس تھانے کا چارج لینے کے فوراً بعد میں نے علاقے میں مخبروں کا جال بچھا دیا اور ہر اُس مسلمان اور سکھ خاندان کی دشمنیوں، پچھلی لڑائیوں اور ان کے آئندہ ارادوں کی ہسٹری اپنے پاس محفوظ کر لی جن کے ہاں لڑائی جھگڑے اور خون خرابے ہوتے رہتے تھے۔ وہاں کے عادی لٹھ بازوں اور فسادیوں کی فہرست بھی تیار کر لی۔ پولیس کے خوشامدیوں اور دو طرفہ مخبری کرنے والوں کے نام بھی لکھ لیے۔ چھ مہینوں میں میرے پاس دشمنی کے زمرے کی کچھ وارداتیں آئیں جن کی تفتیش میں میری فراہم کی ہوئی معلومات نے بہت مدد کی اور میں نے تھانے میں بیٹھے بیٹھے پوری کامیابی سے مقدمے قائم کر لیے۔

## زہر بہت تیز تھا

ساتویں مہینے کے دوران ایک روز میں تھانے کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ مجھے چند آدمی آتے نظر آئے۔ چار کے کندھوں پر چارپائی تھی۔ چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل الشیر سنگھ سے کہا ــــ "لو الشیرے، آج مسلمانوں نے ایک

اور آدمی پھڑ کا دیا ہے"۔۔۔۔ میں ان لوگوں کو دیکھ کر انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ معمولی سی قسم کے دیہاتی تھے۔ وہ تھانے کے احاطے میں آگئے۔ میں نے وہیں سے پوچھا۔۔۔"زندہ ہے یا مر گیا ہے؟"۔۔۔ سب سے آگے آگے جو آدمی آ رہا تھا اس نے جواب دیا۔۔"مر گیا ہے چوہدری صاحب"۔۔۔ اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ انہوں نے چارپائی برآمدے میں رکھ دی۔

لاش کے منہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ جوان آدمی تھا۔ چہرے کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ ناک سے خون نکل کر اوپر والے ہونٹ پر جم گیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔۔۔ "بڑا ہی تیز زہر دیا ہے"۔

اس کے باپ نے روہانسی آواز میں کہا۔۔۔ "ہاں چوہدری صاحب، زہر دیا ہے"۔

"کس نے؟"

باپ نے سر ہلایا کہ معلوم نہیں اور وہ پھر دھاڑیں مارنے لگا۔ مقتول اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ان لوگوں سے جو معلومات ملیں ان سے پتہ چلا کہ یہ غریب سا گھرانہ ہے۔ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں نہ کسی پر شک ہے نہ شک کی کوئی وجہ ہے۔ وہ صبح روزمرہ کی طرح کھیتوں پر گیا اور تقریباً بارہ بجے اس حالت میں واپس آیا کہ اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا سینے پر۔ آنکھیں باہر آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں گر پڑا۔ ناک سے خون نکل رہا تھا۔ اٹھاتے اٹھاتے مر گیا۔ لوگ آگئے۔ سب نے کہا کہ تھانے لے جاؤ۔ اسے کسی نے زہر دیا ہے۔

مقتول کا نام قدیر تھا۔ اس کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ ابھی آٹھ مہینے ہوئے تھے۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے قدیر کے باپ نے بتایا کہ میاں بیوی میں کوئی ناچاقی

بیوی کے چال چلن پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ قدیر کی ماں چھ سال ہوئے مرگئی تھی۔ اس کی ایک بہن تھی۔ عمر بیس سال کے قریب۔ غیر شادی شدہ تھی۔ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ سسرال کے ساتھ بھی تعلقات ٹھیک تھے۔

"ضروری نہیں کہ میاں بیوی آپس میں لڑیں تو ہی ناچاقی کا پتہ چلتا ہے۔ میں نے قدیر کے باپ کو الگ بٹھا کر کہا۔ "بعض اوقات میاں بیوی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں لیکن کسی کو پتہ تک نہیں چلتا۔ اچھی طرح غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ شادی کے بعد قدیر یا اس کی بیوی میں تم نے کوئی تبدیلی دیکھی تھی؟"

بوڑھے نے بہت سوچا۔ میں نے اسے سوچنے میں مدد دی۔ لقمے دیئے تو اس نے کہا۔ "شادی کے ایک ماہ بعد قدیر چُپ چُپ رہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہنسی مذاق بھی کیا کرتا تھا لیکن ایک ہی مہینہ گزرا تو قدیر میں پہلے والی ہنسی نہیں رہی تھی۔"

"اور اس کی بیوی طبیعت کی کیسی ہے؟"

"جس طرح دیہات کی لڑکیاں ہوتی ہیں"۔ باپ نے جواب دیا — "اس میں کوئی شوخی نہیں۔ گھر کا کام کاج دلچسپی سے کرتی ہے۔ کھیتوں میں بھی جاتی ہے۔ قدیر کی بہن کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہُوا"۔

میں اس کی ہر ایک بات پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پہلے کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ دیہات کے لوگ کسی قیمت پر تسلیم نہیں کرتے کہ ان کی بیٹی یا بھوریاان کا بیٹا یا داماد بد چلن ہے۔ اپنے شادی شدہ بیٹوں کی ازدواجی زندگی کے متعلق وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ اس کی بیوی اسے بہت چاہتی ہے۔ یہ کوئی باپ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے بیٹے کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ اسے اس کی بیوی ناپسند کرتی ہے۔ قدیر

کے کیس میں مجھے یہی شک ہو رہا تھا۔

میں نے تفتیش کی جو زمین اپنے ذہن میں بنائی وہ یہ تھی کہ اسے بیوی نے زہر دیا ہے یا بیوی کے ایما پر اس کے آشنا نے یا قدیر نے خود زہر کھایا ہے۔ خودکشی کی وجہ اس کی اپنی بیوی کی بدچلنی بھی ہو سکتی تھی اور اپنی جوان بہن کی بدچلنی بھی۔ بدچلن بہن یا بیوی کو دیہاتی زندہ نہیں رہنے دیا کرتے لیکن بعض شریف خاوند یا بھائی اپنے آپ کو ختم کر لیا کرتے ہیں۔

## جب اس عورت کو دیکھا

کیس رجسٹر کیا۔ کاغذات تیار کیے اور لاش انہی لوگوں سے اٹھوا کر گیارہ میل دور قصبے کے سول ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اپنے مخبروں کے جال کو بیدار کیا۔ انہیں ضروری ہدایات بھیجیں۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی جب میں مقتول کے گاؤں میں داخل ہوا۔ لوگ مجھے مقتول کے گھر تک لے گئے۔ میں نے تمام غیر متعلقہ لوگوں کو گھر کے اندر جانے سے روک دیا۔ اپنے دونوں کانسٹیبلوں کو بھی باہر ہی کھڑا رہنے کو کہا اور میں اکیلا اندر گیا۔ اندر گاؤں کی عورتیں ماتم کے لیے جمع تھیں۔ میں نے سب کو نکال دیا۔

گھر میں قدیر کے باپ کے علاوہ دو لڑکیاں رہ گئیں۔ ایک بلاشک وشبہ قدیر کی بہن تھی مگر دوسری کو دیکھا تو میں نے اپنے وجود میں بجلی کا جھٹکا محسوس کیا۔ پھر اس طرح ہوا جیسے بہت ہی تیزی سے میرے سر سے پاؤں تک بجلی کی کرنٹ گزر کر زمین میں چلی گئی

ہو۔ میں بالکل بیان نہیں کر سکتا کہ اس میں کیا کشش تھی۔ میں پوری بے شرمی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ اس عورت کی خاطر اگر مجھے کسی آدمی کو قتل کرنے کی ضرورت پڑتی تو میں قتل کر گزرتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ تفتیش میں مجھے کہیں اور بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ قتل کا باعث یہی عورت ہے۔ اگر یہ واردات خودکشی کی ہے تو اس کا باعث بھی یہی عورت ہے۔

قدیر کی بہن کو میں نے بہت ہی گہری نظروں سے دیکھا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس کی چال ڈھال کو پرکھا۔ وہ جوان تھی۔ شکل کی بری نہیں تھی لیکن دیکھنے سے اس پر بدچلنی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم میں صرف دیکھنے سے اسے اچھے چلن کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا تھا۔

قدیر کی بیوی کو میں نے اندر بلایا۔ میں صحن میں بیٹھنے کی بجائے کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ مقتول کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ "چوہدری صاحب دودھ پئیں گے یا چائے؟ آپ رات کی روٹی یہیں کھائیں گے۔ میں غریب آدمی ہوں قبول کر لینا۔ گھر میں مرغیاں ہیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کیے اور کہا کہ میں ماتم والے گھر بیٹھا ہوں۔ مرنے والے کا ابھی جنازہ بھی نہیں پڑھا گیا۔ مجھے گناہ گار نہ کرو۔ میں اگر ساری رات یہاں بیٹھا رہا تو بھی کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں۔ پیاس لگی تو پانی مانگ لوں گا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ کبھی کھانے پینے کا لالچ نہیں کیا تھا۔ روپے پیسے کا کوئی لالچ نہ تھا۔ اللہ نے اس کا مجھے صلہ دے دیا ہے۔ آج سر اونچا کر کے بات کر سکتا ہوں اور اس سال تو خدا نے ایک معجزہ دکھایا ہے۔ میری اراضی کا علاقہ پانی میں ڈوب گیا ہے لیکن میری اراضی پانی سے صاف بچی ہوئی ہے۔ اگر دیکھیں تو آپ حیران ہوں گے۔ فصل کا ایک پودا ضائع نہیں ہوا۔

میں سمجھتا ہوں اللہ نے مجھے نیک نیتی کا انعام دیا ہے۔

# زہر کا شک بیوی نے کیا

قدیر کی بیوی اندر آئی۔ میں نے قدیر کے باپ کو باہر بھیج دیا۔ میں نے اس عورت کو بہت ہی غور سے دیکھا۔ اس نے دو تین دنوں سے کنگھی نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر اُداسی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا جو کالا بھی نہیں تھا، گندمی بھی نہیں تھا۔ جوانی کے خون کا جوش چہرے پر صاف نظر آتا تھا۔ اس کی جو کشش تھی وہ اس کی آنکھوں میں تھی یا ہونٹوں کی ساخت میں یا شاید دونوں نے مل کر اس کے چہرے کو پُراسرار سا حُسن دیا تھا۔ سر کی گولائی اور پیشانی کی ساخت کی اپنی ایک دلکشی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ ہونٹوں کے کونوں پر مسکراہٹ نظر آتی تھی۔ پھر اس کی گردن کی لمبائی تھی۔ اور خدا نے اسے جو قد بُت دیا تھا وہ نہ لمبا تھا نہ چھوٹا۔ عجیب طرح کا موزوں قد تھا۔ چال ایسی جو میں نے کم ہی کسی عورت میں دیکھی ہو گی۔ اس کے بکھرے ہوئے بے ترتیب بال مجھے بہت ہی اچھے لگ رہے تھے۔ اس کی عمر تئیس سال کے لگ بھگ تھی۔

میں اس سے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہتا تھا جس سے اسے شک ہو تا کہ میں اس پر شُبہ کر رہا ہوں۔ میں نے پوچھا۔ "تمہارے خاوند کو زہر دینے والا کون ہو سکتا ہے؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "اللہ جانتا ہے۔ مجھے کسی پر شُبہ نہیں۔"

میں نے اس کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے انداز کو غور سے دیکھا۔ مجھے کچھ بے تعلقی سی نظر آئی جیسے اسے اس کا اتنا افسوس نہیں جتنا ایک بیوی کو ہوتا

چاہیئے۔ میں نے قدیر کے باپ سے تھانے میں پوچھا تھا کہ جب قدیر مرگیا تو سب سے پہلے کس نے کہا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے؟ اس نے جواب دیا تھا۔ "سب سے پہلے قدیر کی بیوی نے کہا تھا" ــــ پھر میں نے اسے کہا تھا کہ قدیر کی بیوی کے الفاظ کیا تھے؟ باپ نے بتایا تھا کہ قدیر کو ہم نے اٹھا کر چارپائی پر پھینکا تو اس کی بیوی نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ مار کر کہا تھا ــــ "ہائے اسے تو کوئی زہر دے گیا ہے"۔

میں نے یہ الفاظ خاص طور پر ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے سے پہلے ہی تفتیش شروع کر دی تھی کیونکہ مقتول کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے کوئی تیز زہر دیا گیا ہے۔ میں نے پہلے بھی ایسی لاشیں دیکھی تھیں۔

میں نے قدیر کی بیوی سے پوچھا۔ "تم نے کبھی زہر سے مرا ہوا آدمی دیکھا ہے؟"

"کبھی نہیں"۔

"پھر تم نے قدیر کو دیکھتے ہی کیوں کہا تھا کہ اسے کوئی زہر دے گیا ہے"؟

وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ گھبرا گئی۔ میں نے ذرا حوصلہ دیا تو اس نے کہا۔ "اسے کوئی بیماری تو تھی نہیں۔ کھیتوں میں گیا تو بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے صرف زہر کا شک تھا۔ میں نے کہہ دیا"

میں نے اسے اس نقطے پر گھیرنے کی کوشش نہ کی۔ میرے دل میں شک بیٹھ گیا کہ اس لڑکی کو علم تھا کہ آج اس کے خاوند کو زہر دیا جائے گا۔ ورنہ وہ یہ کہتی کہ اسے کسی نے مارا پیٹا ہے یا سانپ نے ڈس لیا ہے یا اسے اچانک اندر سے کوئی تکلیف اٹھی ہے یا وہ کچھ بھی نہ کہتی۔ یوں وثوق سے رائے نہ دیتی۔

میں نے اسے اپنے جال سے نکل جانے دیا اور کہا۔ "تمہارا خیال ٹھیک تھا۔ میں نے

بھی اسے دیکھتے ہی کہ دیا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے ـــــ اس کے چہرے پر جو کھچاؤ آ گیا تھا وہ دُور ہو گیا۔ میں نے اسے تسلی آمیز لہجے میں کہا ـ" دیکھو تم گھبراؤ نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تم پر شک کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم عورت ذات ہو اور مسلمان ہو، تم تھانے اور کچہری نہ چڑھو۔ اسی لیے تمہارے گھر آ گیا ہوں ورنہ تمہیں تھانے بلا لیتا۔ میں یہ باتیں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے اس آدمی کا پتہ چل جائے جس نے تمہیں اس عمر میں بیوہ کر دیا ہے"

اس نے دھیمی آواز میں کہا ـ" جس طرح اس کی لکھی تھی پوری ہو گئی"

" قدیر صبح کیا کھا کر گیا تھا؟"

" صبح صرف دُودھ پیا کرتا تھا" اس نے جواب دیا" آج بھی دُودھ پی کر گیا تھا"

" دودھ اسے کس نے دیا تھا؟"

" اس کی بہن نے ڈال دیا تھا"

" دوپہر کی روٹی کس وقت کھاتا تھا؟"

" کبھی کھیتوں میں کبھی گھر میں" اس نے جواب دیا" جس روز گھر کھانی ہوتی تھی کہ جایا کرتا تھا کہ آج روٹی نہ لانا، گھر آ جاؤں گا"

" کھیتوں میں روٹی تم لے جاتی ہو یا اس کی بہن؟"

" ہمیشہ میں ہی لے جاتی ہوں"

" آج بھی تم گئی تھیں؟"

" نہیں" اس نے جواب دیا" آج تو روٹی گئی ہی نہیں۔ کہ گیا تھا کہ گھر آ کر کھاؤں گا لیکن وہ اس حال میں واپس آیا"

" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالی پیٹ تھا"

"ہاں ۔ خالی پیٹ ہی ہوگا" اس نے جواب دیا ۔ "اس نے روٹی نہیں کھائی تھی"

"قدیر کی بہن کیسی لڑکی ہے؟"

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا ۔ مَیں سمجھ گیا کہ یہ سوال اس نے پسند نہیں کیا ۔ مَیں نے اس کے چہرے میں تبدیلی بھی دیکھی ۔ میں نے اسے کہا ۔ "میرا پُوچھنے سے مطلب یہ ہے کہ بعض بھائی خراب بہنوں کی وجہ سے مارے جاتے ہیں یا اپنے آپ کو مار دیتے ہیں"

"یہ لڑکی خراب نہیں ہے" اس نے کہا ۔ "اگر مَیں کوئی ایسی بات دیکھتی تو اسے میں اپنے ہاتھوں ختم کر دیتی"

میں نے اسے باہر بھیج کر قدیر کی بہن کو بلایا ۔ وہ ڈر اور شرم کی وجہ سے بول ہی نہیں رہی تھی ۔ میں نے اس کے باپ کو اندر بلا کر اس کے پاس بٹھا دیا اور دونوں سے وہی باتیں پوچھیں جو قدیر کی بیوی سے پوچھی تھیں ۔ انہوں نے وہی جواب دیئے جو میں سُن چکا تھا ۔ مقتول کو دودھ بہن نے ڈال کر دیا تھا ۔ اس میں سے اس نے باپ کو بھی دودھ پلایا تھا ۔ قدیر کے لیے روٹی نہیں گئی تھی ۔ قدیر کی بیوی کے خلاف دونوں نے کوئی بات نہ کی ۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے دل میں اس کے خلاف ذرا سی بھی کوئی بات ہے تو نکل آئے لیکن کوئی شکایت سامنے نہ آئی ۔

# پوسٹ مارٹم نے بیوی کو جھٹلا دیا

میں جب تھانے میں پہنچا تو رات کے آٹھ بج چکے تھے ۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ چکی تھی اور لاش ہسپتال سے گاؤں کے لوگ لے گئے تھے ۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت زہر سے

واقع ہوئی ہے، لیکن پیٹ کی جو کیفیت بیان کی گئی تھی وہ قدیر کی بیوی، بہن اور باپ کو جھٹلا رہی تھی۔ رات کو مخبروں نے آکر بتایا کہ قدیر کی بہن کا چال چلن صاف ہے۔ قدیر کی بیوی کے متعلق یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ خراب تھی یا کسی کے ساتھ اس کے چوری چھپے کے تعلقات تھے لیکن شک ضرور تھا۔ وہ اپنے خاوند کے گھر کی حکمران تھی۔ جب جی چاہے اپنے گاؤں چلی جاتی تھی لیکن قدیر کا باپ اور بہن اس سے خوش تھے۔ قدیر کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بیوی سے خوش تھا یا نہیں۔

میں دوسرے دن صبح صبح مقتول کے گھر چلا گیا۔ مجھے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان سب کو تھانے بلا سکتا تھا لیکن میری کوشش یہ تھی کہ جوان لڑکیوں کو تھانے سے بچائے رکھوں۔ میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہاں گیا تھا۔ میں نے قدیر کے باپ کو اندر بلایا اور اس سے پوچھا "کل قدیر نے دن کی روٹی کہاں سے کھائی تھی؟"

اس نے جواب دیا ــــ "اس کی روٹی نہیں گئی تھی"۔

میں نے قدیر کی بہن کو بلایا اور اس کے باپ کے سامنے یہی سوال پوچھا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا۔

میں نے قدیر کی بہن سے کہا ــــ "اچھی طرح یاد کر کے بتاؤ کہ کل قدیر کے گھر آنے تک اس کی بیوی باہر گئی تھی؟"

اس نے سوچ کر جواب دیا ــــ "ہاں گئی تھی۔ یہ نہیں پتہ کہاں گئی تھی"۔

"کتنی دیر بعد واپس آئی تھی؟"

"ذرا دیر بعد ہی آئی تھی"۔ قدیر کی بہن نے جواب دیا۔

"جب وہ گئی تھی تو اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی؟"

"میں نے یہ نہیں دیکھا۔"

"اُس وقت روٹی پک چکی تھی؟"

"جی۔ پک چکی تھی۔"

"کس نے پکائی تھی؟"

"میں نے۔"

"قدیر کی بیوی نے روٹی تمہارے ساتھ کھائی تھی یا اکیلے؟"

"اس نے واپس آکر اکیلے ہی کھائی تھی۔"

"کبھی ایسا ہُوا ہے کہ قدیر نے کھیتوں میں کسی اور کے ساتھ روٹی کھائی ہو؟"

"ایسا ہو سکتا ہے۔" اس کے باپ نے جواب دیا۔" لیکن میں کہ نہیں سکتا کہ کل اس نے کسی کے ساتھ روٹی کھائی تھی یا نہیں۔"

میں نے قدیر کی بیوی کو بُلایا۔ وہ اندر آئی تو میں نے باپ اور بہن کو باہر بھیج دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔" کل تم روٹی کھانے سے پہلے کہاں گئی تھی؟" — اس نے ایک گھر بتایا۔ میں نے پوچھا —" تم بہت دیر وہیں بیٹھی رہیں؟"

"جی۔"

"گاؤں سے باہر تم اس گھر میں جانے سے پہلے گئی تھیں یا بعد میں؟"

اس نے گھبرا کر جواب دیا —" میں گاؤں سے باہر نہیں گئی تھی۔"

"دیکھو لڑکی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا —" کل کی بات کچھ اور تھی۔ آج بات کچھ اور ہو گئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی مسلمان عورت کو تھانے نہ بلاؤں۔ میں اب بھی یہی چاہتا ہوں۔ میری قسم نہ توڑو۔"

میں نے کچھ سوچ کر اپنا ہاتھ آگے کیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس نے چونک کر میرے منہ کی طرف دیکھا۔ اس کا سانولا رنگ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آ گئی کہ میں زیادہ دیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکال لیا جو میرے لیے نئی بات تھی ورنہ جو عورتیں پولیس کی لپیٹ میں آ جاتی تھیں وہ تھانیداروں کے اشاروں پر ناچا کرتی تھیں مگر اس عورت نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں سامنا نہ کر سکا۔ میں مسکرایا۔ میں نے جو کچھ سوچ کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا، میرا وہ خیال غلط نکلا۔ وہ بدکار نہیں تھی۔ لیکن ایسا جھوٹ بول چکی تھی کہ اس پر شک پختہ ہو گیا تھا۔

میں جب مسکرایا تو اس نے کہا "آپ کس چکر میں ہیں تھانیدار جی؟ .... مجھ پر شک ہے تو مجھے باندھ لو۔ ہتھکڑیاں لگا لو۔ میرے جسم کو اس طرح پھر ہاتھ نہ لگانا" میں ابھی چپ ہی تھا کہ اس نے کہا "ہاں پوچھو کیا پوچھتے ہو"۔

میرے تجربے نے مجھے بتایا کہ یہ عورت بدکار نہیں۔ خاوند کے علاوہ کسی اور کو چاہتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا دوستانہ ہیر رانجھے والا ہے۔ یہ عام قسم کے ناجائز تعلقات والا معاملہ نہیں اور تیسری بات یہ کہ یہ عورت قتل کر سکتی ہے۔ اب مجھے جو بھی بات کا یقین کرنا تھا کہ اس نے اپنے خاوند کو خود زہر دیا ہے یا اپنے آشنا سے دلوایا ہے۔

"میں کسی اور چکر میں نہیں پڑا۔ تم تسلی رکھو" میں نے اسے کہا اور پوچھا "مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے قدیر کو کھیتوں میں رات کی روٹی کھلائی تھی یا نہ"۔

"کب؟"

"کل"

"کل اس کے لیے روٹی نہیں گئی تھی"۔

میں نے باہر سے اپنے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے اس گھر کی کسی عورت سے یہ پوچھنے کے لیے بھیج دیا کہ قدیر کی بیوی کل اس کے گھر کتنی دیر بیٹھی رہی تھی۔ میں نے یہ ہدایت اسے الگ کر کے دی تھی۔ اندر آ کر میں نے قدیر کی بیوی سے پوچھا۔ "اس کے پیٹ میں روٹی کہاں سے آئی تھی؟"

"میں کیا جانوں؟"

ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ معدے میں غیر ہضم شدہ گندم کی روٹی تھی جس میں زہر کی آمیزش پائی گئی۔ روٹی ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ پہلے معدے میں گئی تھی۔ قدیر کی بیوی کہہ رہی تھی کہ مقتول نے روٹی کھائی ہی نہیں تھی۔

میں نے اس خوبصورت عورت کو باتوں میں لگائے رکھا۔ اسے ڈرایا دھمکایا بالکل نہیں۔ اشاروں اشاروں میں اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ جذبات سے اندھی ہو کر بیویاں آشناؤں سے مل کر خاوندوں کو مروا دیتی ہیں مگر ان کا حشر بہت ہی برا ہوتا ہے۔ کبھی کوئی عورت بچ کے نہیں گئی۔ وہ شاید میرے اشارے سمجھ رہی تھی۔

## مرے ہوئے کوّے، چڑیاں اور گلہری

کانسٹیبل آ گیا۔ میں نے باہر جا کر اس سے رپورٹ لی۔ اس گھر سے اسے پتہ چلا تھا کہ کل قدیر کی بیوی تھوڑی سی دیر کے لیے وہاں گئی تھی۔ اتنی دیر وہاں نہیں رہی جتنی وہ بتا رہی تھی۔ یہ اس کا دوسرا جھوٹ تھا۔ پولیس والے اس صورت میں یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ مشتبہ کو، وہ عورت ہو یا مرد، تھانے لے جاتے ہیں۔ رات بھر جگائے رکھتے ہیں۔

طرح طرح کی اذیتیں دیتے ہیں جسے انگریز تھرڈ ڈگری کہا کرتے تھے۔ لیکن میں اس کے خلاف تھا۔ میں مشتبہ کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ اس عورت کو بھی میں نے یہ تاثر دے کر آزاد رہنے دیا کہ میرا شک رفع ہو گیا ہے۔

میں جانے کے لیے اٹھا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "میری نیت پر شبہ نہ کرنا۔ پولیس کو بہت سی ایسی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں جو دوسروں کو اچھی نہیں لگتیں۔ اگر میری نیت خراب ہوتی تو میں تمہیں تھانے بلا لیتا۔"

وہ پہلی بار مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں جادو کا اثر تھا۔

میں وہاں سے نکل کر گاؤں سے باہر چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ قدیر کو روٹی کس نے کھلائی ہے۔ میں کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ سب سے پوچھا کہ کل قدیر کس جگہ کام کر رہا تھا۔ کسی نے بھی صحیح جواب نہ دیا۔ میں چلتا گیا اور ایک درخت کے نیچے مجھے دو کوّے مرے ہوئے نظر آئے۔ قریب گیا تو ادھر ادھر پانچ چڑیاں مری ہوئی دیکھیں اور وہیں ایک گلہری بھی مری پڑی تھی۔ زمین کچی تھی۔ وہاں صاف نشان تھے۔ دو تین آدمی وہاں بیٹھے رہے تھے۔

وہاں دو قسم کے کھُرے یا پاؤں کے نشان تھے۔ ایک ننگے پاؤں کے جو کھیت سے درخت تک گئے تھے اور ایک جوتی والے جو وہاں تک آئے بھی تھے اور گئے بھی تھے مگر گاؤں کی طرف نہیں گئے تھے۔ یہ کھُرے اور مرے ہوئے پرندے بتا رہے تھے کہ مقتول کو یہاں زہر دیا گیا ہے اور زہر دینے والا کوئی مرد ہے جو گاؤں کی طرف سے نہیں آیا تھا۔ زہر کھلا کر اُدھر ہی چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔

میں نے گاؤں سے دو گھوڑے منگوائے۔ دونوں گھوڑے ایک کانسٹیبل کو دے کر

ایک بوڑھے کھوجی کی طرف بھیج دیا۔ معاملہ صاف تھا۔ قدیر کو اس درخت کے نیچے روٹی کھلائی
گئی تھی۔ بچے ہوئے ٹکڑے وہیں پھینک دیئے گئے جو کوؤں، چڑیوں اور گلہری نے کھائے
اور سب مر گئے۔ یہ آدمی قدیر کی بیوی کا دوست ہو سکتا تھا۔

کھوجی وہاں سے کوئی تین میل دُور رہتا تھا۔ ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کانسٹیبل اسے
گھوڑے پر بٹھا کر لے آیا۔ میرے کہنے پر وہ زمین پر جھک گیا۔ ننگے پاؤں کا کُھرا دیکھ کر اس نے
بتایا کہ یہ آدمی اس کھیت سے کام کرتے کرتے درخت تک آیا تھا۔ کھوجی نے درخت سے
دس بارہ قدم دُور رک کر کہا۔ "یہاں اس نے ایک آدمی کے ساتھ رُک کر باتیں کیں یا
ہاتھ ملایا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔ پھر اکھٹے چلے اور یہاں (درخت کے نیچے)
بیٹھ گئے۔ پھر ننگے پاؤں والا واپس کھیت میں چلا گیا اور جُوتی والا اُس طرف چلا گیا"۔ بوڑھا
کھوجی جُوتی والے کُھرے پر چل پڑا۔ کچھ دُور جا کر اس نے کہا۔ "یہاں رُک کر اُس نے پیچھے
دیکھا اور آگے چل پڑا"۔ پھر کچھ دُور آگے جا کر اس نے کہا۔ "یہاں بھی وہ رُکا ہُوا
ہے اور پیچھے کو گھوما ہے"۔

اگر آپ کسی کھوجی کو کُھرا اُٹھاتے دیکھیں، اس کے ساتھ ساتھ چلیں، اس کی باتیں سُنیں
تو آپ ایسا محسوس کرنے لگیں گے جیسے آپ کسی جن کی باتیں سُن رہے ہیں۔ بعض جگہوں پر
ہم اور آپ کو کوئی نشان نظر نہیں آئے گا لیکن کھوجی کو سب کچھ نظر آرہا ہوگا۔ کھوجیوں کی
باتیں بڑی پُراسرار ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے کھوجی نے ایک جگہ رُک کر کہا۔ "وہ یہاں کھڑا
جُوتی اتار کر جھاڑ رہا ہے۔ جُوتی میں شاید کنکری آگئی ہے۔۔۔ یہاں وہ پھر رُک گیا ہے"۔
یہ باتیں بعض لوگوں کو ڈرا دیتی ہیں اور کھوجی پُر اسرار کی مانند نظر آنے لگتا ہے۔ ہمارے ملک
میں اس فن کی ... اہمیت ... دی گئی۔ اب تو یہ فن دم توڑ رہا ہے۔ یہ کھوجی سکاٹ لینڈ یارڈ

کے سراغ رسانوں کو مات کر سکتے ہیں۔

ہمیں کھوجی ڈیڑھ میل دُور لے گیا اور آگے ریلوے لائن آگئی۔ کھوجی نے بتایا کہ وہ ریلوے لائن پر چڑھ گیا ہے۔ آگے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کدھر گیا کیونکہ وہ ریلوے لائن کے درمیان چلتا گیا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ راستے میں کھوجی کے کہنے کے مطابق رُک کر پیچھے جو گھومتا رہا ہے وہ دیکھتا ہوگا کہ قدیر زہر کھا کر ابھی کھڑا ہے یا گر پڑا ہے۔ قدیر کے پیٹ میں جو روٹی تھی وہ اسی آدمی نے اسے کھلائی تھی اور اس کا قدیر کی بیوی کو علم تھا۔

## ریشمی رومال، عورت کے بال

کھوجی کو مَیں نے یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ یہ کھُرا اپنی آنکھوں میں رکھے۔ مَیں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے گھوڑے پر گاؤں چھوڑ آئے میں تھانے چلا گیا۔ تھکن سے بُرا حال تھا۔ مَیں نہا رہا تھا تو دماغ میں ایک بات آئی۔ مَیں نے یہ معلوم نہیں کیا تھا کہ قدیر کی بیوی جس گھر میں گئی تھی اور کہتی تھی کہ وہاں بہت دیر رہی ہوں، اس گھر میں کوئی جوان آدمی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے وہی اس کا دوست ہو اور وہ دیکھنے گئی ہو کہ وہ قدیر کو زہر دینے چلا گیا ہے یا نہیں۔ مَیں نے اگلے دن کے لیے یہ بات نوٹ کر لی۔

اگلا دن چڑھا تو میرے لیے ایک اور مصیبت آگئی۔ نمبردار اور چوکیدار اطلاع لے کر تھانے آئے کہ رحمت نام کا ایک جوان آدمی جس کی عمر چوبیس یا پچیس سال تھی، رات کو گاڑی کے نیچے آکر کٹ گیا ہے۔ لاش وہیں لائن پر پڑی ہے۔ مَیں نے پہلے تو اس حادثے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ یہ مین لائن تھی۔ بڑی تیز رفتار گاڑیاں گزرتی رہتی تھیں۔ یہ آدمی

کسی گاڑی کی لپیٹ میں آگیا ہوگا یا اس نے خودکشی کی ہوگی۔ بہرحال فوری طور پر وہاں پہنچنا ضروری تھا۔

جا کر دیکھا۔ لاش کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ کمر سے اوپر والا دھڑ لائن کے درمیان پڑا تھا اور نیچے والا دھڑ لائن سے باہر۔ گاڑی کے پہیے کمر کو کاٹتے گزر گئے تھے۔ مگر جسے میں حادثہ یا خودکشی سمجھ رہا تھا وہ قتل کی واردات تھی۔ وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور مرنے والے کے گھر کی عورتیں اور مرد رو رہے تھے۔ فوری طور پر مجھے جو معلومات لوگوں سے اور مقتول کے لواحقین سے ملیں وہ یہ تھیں۔ اس کا نام رحمت علی تھا۔ غیر شادی شدہ تھا۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا جو قدیر کی بیوی کا میکہ گاؤں تھا۔ یہ گاؤں قدیر کے گاؤں سے تقریباً دو میل دور تھا۔

رحمت رات کا کھانا کھا کر گھر سے نکلا۔ رات بھر غیر حاضر رہا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ کسی نے اس کے گھر والوں کو اطلاع دی کہ رحمت کی لاش ریلوے لائن پر کٹی پڑی ہے۔ لاش جہاں پڑی تھی وہ جگہ قدیر کے گاؤں سے نصف میل یا پون میل دور تھی رحمت کے باپ نے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ رحمت نے خودکشی کی ہے، مجھے یہ وجہ بتائی کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے ساتھ ہم کرا رہے تھے مگر اس نے یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بوڑھے کو ابھی یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ اس کے بیٹے نے خودکشی نہیں کی۔

میں نے لاش کے دونوں ٹکڑے چارپائی پر ڈلوائے۔ اس نے کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ بھی کچلا گیا تھا۔ بُری طرح پھٹا تھا۔ اس کی پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے ایک ریشمی رومال نکلا۔ اس کے کونے میں گانٹھ دی ہوئی تھی۔ میں نے گانٹھ کھولی تو

اس میں سے کسی عورت کے چند ایک بال گول گچھے کی صورت میں برآمد ہوئے۔ شہروں میں مقتولوں یا خودکشی کرنے والوں کی جیبوں سے محبت کے خطوط یا لڑکیوں کی تصویریں نکلتی ہیں اور دیہاتوں میں جونا کام عاشق مرتے ہیں ان کے پاس لڑکیوں کی دی ہوئی عجیب عجیب سی نشانیاں ہوتی ہیں۔ رحمت جس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اس کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ قدیر کی بیوی اسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ پولیس والوں کی ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کہ قدیر کی بیوی کہیں رحمت کو ہی تو نہیں چاہتی تھی؟ مگر یہ خیال بھی آیا کہ قدیر تو مر چکا ہے پھر رحمت کو کس نے قتل کیا؟ شاید وہ کسی دوسری لڑکی کو چاہتا ہوگا۔ وہ چونکہ رات بھر غیر حاضر رہا تھا اس لیے میں نے کھوجی کی ضرورت محسوس کی۔ میں نے اسی وقت کانسٹیبل کو اسی بوڑھے کھوجی کو لانے کے لیے بھیج دیا جس نے کل کھیتوں میں کھرا اٹھایا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ وہ رحمت کے گاؤں کے باہر اس کا کھرا ڈھونڈے اور معلوم کرے کہ وہ کہاں کہاں گیا تھا۔ کھوجیوں کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ رحمت کے پاؤں میں جوتی تھی۔ اسے مٹی پر رکھ کر کھرے کی ساخت دیکھی جا سکتی تھی۔

ایک مشکل ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ دیہات کے سینکڑوں لوگ لاش دیکھنے کے لیے آ گئے تھے۔ انہوں نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور تک کوئی کھرا سلامت نہیں رہنے دیا تھا۔ کھوجی نے لاش کی جوتی لے کر لاش کو غور سے دیکھا پھر تماشائیوں کے ہجوم میں کسی ایسے جوان آدمی کو ڈھونڈنے لگا جس کا قدبت اور جسم رحمت جیسا ہو۔ جب وہ لوگوں کو غور سے دیکھ رہا تھا تو لوگ وہاں سے کھسکنے لگے۔ میں نے سب کو روکا اور سمجھایا۔

کھوجی کو ایک آدمی نظر آ گیا۔ اسے رحمت کی جوتیاں پہنائی گئیں۔ اتفاق سے اسے

جوتی فٹ آ گئی۔ اس کا جسم رحمت سے ملتا جلتا تھا۔ کھوجی نے لوگوں کو پیچھے ہٹا کر اس آدمی کو کچی زمین پر چند قدم چلایا پھر اس سے جوتی اتروا لی۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر کھروں کو دیکھا۔ ہجوم پر سناٹا طاری تھا۔ کھوجی جادوگروں کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اس نے کھروں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے جھک کر کھرے کو دیکھا اور اچانک اس نے زور سے زمین پر ہاتھ مارا۔ وہ اچھل کر اٹھا اور میرے قریب آ کر بولا۔

"یہ کھرا کل سے میری آنکھوں میں ہے۔ یہ وہی کھرا ہے جو میں کھیتوں سے اٹھا کر ریلوے لائن تک لایا تھا۔"

کھوجیوں کے کمالات جس کسی نے دیکھے ہیں وہ جانتا ہے کہ کھوجی اگر کوئی کھرا ایک بار دیکھ لیں تو کئی کئی سال اسے نہیں بھولتے۔ مشکل یہ ہے کہ کھوجیوں کی شہادت کو عدالت تسلیم نہیں کرتی۔ وہ صرف پولیس کی تفتیش میں مددگار ہوتے ہیں۔ جب اس بوڑھے نے کہا کہ یہ کھرا اس نے کل دیکھا تھا تو میں نے اس کی رائے کو فوراً تسلیم کر لیا۔ مجھے یہ خوشی ہوئی کہ قدیر کا قاتل مل گیا ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اس قاتل کو کس نے قتل کیا ہے؟ وہ یقیناً قتل ہوا تھا۔ لائن پر خون بالکل نہیں تھا۔ گردن پر جمے ہوئے خون کی گہری لال اور نیلی لکیریں بتا رہی تھیں کہ اس کا گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے پھر لائن پر پھینکا گیا ہے۔

## مقتول کا قاتل مقتول

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے تصدیق کر دی۔ رحمت کا گلا کسی نے ہاتھوں سے گھونٹا

تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق موت رات کے پہلے پہر واقع ہوئی تھی اور لاش پر سے گاڑی کم و بیش چار گھنٹے بعد گزری تھی۔ میں نے مقتول کے باپ سے کوئی دو گھنٹے صرف کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس لڑکی کو چاہتا تھا؟ اس کا دشمن کون تھا؟ مگر باپ کو کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ رحمت کبھی کبھی رات کو گاؤں سے باہر چلا جاتا اور بہت دیر سے واپس آتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”قدیر کی بیوی تمہارے گاؤں کی رہنے والی ہے۔ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کوئی ایک سال ہوا رحمت نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ اس لڑکی کا رشتہ میرے لیے مانگو۔“ رحمت کے باپ نے کہا۔ ”لیکن ہم باہر کی ذات کا رشتہ نہ لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ماں نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنی ذات برادری کی کسی لڑکی کا نام لو۔ اس نے کہا تھا کہ میں تمہارا رشتہ قبول نہیں کروں گا۔“

”تم نے رشتہ ڈھونڈا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”دو رشتے تلاش کیے تھے۔“ اس نے کہا۔ ”مگر اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“

”تو کیا یہ صحیح ہے کہ وہ قدیر کی بیوی کے ساتھ ہی شادی کرنا چاہتا تھا؟“

”اس نے صرف ایک ہی بار ماں سے کہا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کے بعد اس نے اس لڑکی کا نام نہیں لیا۔ پھر اس لڑکی کی شادی قدیر سے ہو گئی۔“

”قدیر کی بیوی جب میکے آتی تھی تو وہ ان کے گھر جاتا تھا؟“

بوڑھے نے سوچ کر جواب دیا۔ ”میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ گاؤں میں کبھی بات نہیں اٹھی۔“

"تمہارا کیا خیال ہے کہ رحمت نے خودکشی کی ہے؟"

"ہاں جی" باپ نے کہا۔ "وہ اندھا تو نہیں تھا کہ گاڑی کے نیچے آگیا۔"

میں نے آگے ہو کر آہستہ سے کہا۔ "تمہارے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے۔"

وہ بدک کر بولا۔ "قتل؟ میرے بیٹے کو کسی نے قتل کیا ہے؟"

"ہاں۔ قتل کیا ہے" میں نے کہا۔ "گلا گھونٹ کر مارا پھر لائنوں پر پھینکا ہے۔ تمہیں کسی پر شک ہے تو بتا دو۔"

"نہیں" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "میری خونی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔"

"تمہاری نہیں تھی" میں نے کہا۔ "رحمت کی تھی۔ اُٹھو۔ تمہارے گاؤں تک چلتا ہوں۔"

میں اس کے گاؤں میں گیا اور رحمت کی ماں اور دونوں بہنوں کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔ "قدیر کی بیوی جب میکے آتی ہے تو تمہارے گھر آیا کرتی ہے؟"

"ہمارے گھر تو وہ سب سے زیادہ آتی ہے" ایک بہن نے جواب دیا۔ "بہت ہنسوڑ ہے۔ پورا پورا دن یہیں گزارتی ہے۔"

"رحمت کے لیے روٹی کھیتوں میں جاتی تھی یا گھر آ کے کھایا کرتا تھا؟"

"وہ کھیتوں پر جاتا ہی کہاں تھا" اس کی ماں نے جواب دیا۔ "بیکار پھرتا رہتا تھا۔"

"تین چار دن گزرے وہ روٹی اپنے ساتھ کیوں لے گیا تھا؟"

وہ سب حیران سی ہو گئیں۔ میرا سوال ہی ایسا تھا۔ میں نے پھر پوچھا۔ "وہ کہیں باہر گیا تھا؟"

"ہاں" ایک بہن نے جواب دیا۔ "کہتا تھا کہ میں شام کو آؤں گا۔ روٹی ساتھ دے دو۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ گیا کہاں تھا؟"

"ہمیں بتا کر تھوڑے ہی جاتا ہے۔" ماں نے کہا ۔۔۔ "صبح گیا اور شام کو آ گیا۔"

یہ تو اب یقین ہو گیا تھا کہ قدیر کو زہر دینے والا رحمت ہے۔ کھوجی نے قدیر کے کھیت کے پاس درخت کے نیچے جو کھُرا دیکھا تھا وہ اسی کا تھا اور اب یہ سراغ بھی مل گیا تھا کہ رحمت قدیر کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی۔ اس کے خاوند قدیر کو رحمت نے زہر اس لیے دیا ہو گا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ شادی کر سکے مگر سوال یہ تھا کہ رحمت کا گلا گھونٹ کر اسے ریلوے لائن پر کس نے پھینکا؟ کیا قدیر کے کسی رشتہ دار کو علم تھا کہ قدیر کا قاتل رحمت ہے اور اس نے رحمت سے خون کا بدلہ لیا ہے؟ اور کیا قدیر کی بیوی کے تعلقات کسی اور آدمی کے ساتھ بھی تھے جس نے رحمت کو رقابت میں قتل کیا ہے؟ اور رحمت کی جیب سے جو رومال اور بالوں کا گچھا برآمد ہوا ہے، کیا وہ قدیر کی بیوی کا دیا ہوا ہے؟

اب مجھے اندھیروں میں ٹٹولنا تھا۔ میرے مخبر بھی کوئی کام کی خبر نہیں لا رہے تھے۔ قدیر کی بیوی کے متعلق وہ جو خبریں لاتے تھے وہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ اس کے متعلق زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ تھی ۔۔۔ "بنگال کی جادوگرنی ہے۔ جس مرد پر نظر ڈالے اس کی روح اس کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ کوئی مرد اس کے قبضے میں چلا جائے تو اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔"

یہ محض گپ بازی تھی۔ اس زمانے میں بنگال کا جادو مشہور تھا جو ایک بے بنیاد روایت تھی۔ قدیر کی بیوی کے متعلق جو رائے مجھ تک پہنچی تھی وہ ان آدمیوں کی تھی جو اسے چاہتے اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔

# عائشہ خوبصورت چڑیل تھی

دیہاتی علاقوں میں ایک کردار اور بھی ہوتا ہے جو عموماً عورت ہوتی ہے۔ اس کردار کو میں پوری طرح بیان نہیں کرنا چاہتا کیونکہ بعض باتیں ذرا ننگی ہیں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ عورت آسمان سے تارے بھی توڑ لاتی ہے۔ اس کا کام ہوتا ہے اُجرت لے کر دوستانے کرانا اور خفیہ پیغام اِدھر اُدھر پہنچانا۔ یہ عورت ہر گھر میں جاتی اور سب کی خدمت کرتی ہے، چاہے کوئی مرد اس سے سر یا ٹانگیں دبوا لے چاہے کوئی عورت اس سے پیٹ ملوا لے۔ وہ ہر کسی کی بھیدی ہوتی ہے۔ ایسی عورتیں بہت ہی ہنس مکھ، ملنسار اور غمخوار ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں میں جادو کا اثر ہوتا ہے۔ جسے چاہیں بلیک میل بھی کر سکتی ہیں اور دوسروں کے آنسو نکال دیں۔ یہ عورتیں اونچی ذات کی نہیں ہوتیں۔

یہاں میں یہ بھی کہہ دوں تو اچھا ہے کہ میں ذات پات کا قائل نہیں۔ یہ عورتیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے کہ اونچی ذات کی نہیں ہوتیں دراصل اُونچی ذات والوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ وہ انہیں روپیہ پیسہ اور دانے وغیرہ دے کر دوسروں کی بیٹیوں کے ساتھ دوستانے کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ یہی عورتیں جو اُن کی خفیہ ایجنٹ ہوتی ہیں خود ان کی بیٹیوں کے دوستانے دوسرے مردوں سے کراتی ہیں۔

میں ایسے کئی کیس سُنا سکتا ہوں جہاں اس قسم کی عورت نے ایک مرد کی دوستی کسی کی بہن سے کرا دی اور اسی مرد کی بہن یا بیوی کی دوستی کسی اور سے کرا دی۔ یہ خباثت پاکستان بننے سے پہلے بھی موجود تھی اور پاکستان کے دیہات میں اب بھی موجود ہے۔ پولیس معاشر

کی بھیدی ہوتی ہے مگر ہم معاشرے کو جب یہ بھید دکھاتے ہیں تو کسی کو بھی شرم نہیں آتی نہ کوئی کان پکڑتا ہے۔

رحمت کے گاؤں میں بھی ایسی ایک عورت تھی۔ مخبروں نے اس کے متعلق بتایا تو میں نے اسے تھانے میں بلا لیا۔ وہ بہت گھبرائی لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ اسے نہ تو ملزموں کی فہرست میں لیا جائے گا نہ گواہوں کی فہرست میں —— میں نے دس روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے کے دس روپے آج کے ایک سو روپوں کے برابر تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ قدیر کی بیوی اور رحمت کے متعلق کچھ بتاؤ۔ اس نے جواب دیا۔

"عائشہ کی بات کرتے ہو؟" —— اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا —— "وہ اگر سارے گاؤں کے مردوں کو کہے کہ ریلوے لائن پر لیٹ جاؤ تو سب لیٹ جائیں گے اور اوپر سے گاڑی گزر جائے گی لیکن چوہدری جی، آپ یہ چاہیں کہ آپ عائشہ کے جسم کی بُو سونگھ لیں تو یہ آپ کا وہم ہو گا۔ ابھی تک وہ مرد پیدا نہیں ہوا جو عائشہ کو موم کر لے"۔ قدیر کی بیوی کا نام عائشہ تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا "تم نے کبھی اسے کسی آدمی کا پیغام دیا تھا؟"

"صرف ایک آدمی کا ..."

"کون تھا وہ؟"

مجھے توقع تھی کہ وہ رحمت کا نام لے گی لیکن اس نے ایک صاحبِ اولاد آدمی کا نام لیا اور کہا —— "میرا جو حشر اس لڑکی نے کیا تھا وہ ساری عمر نہیں بھولوں گی۔ اس نے اپنی شادی پر بھی مجھے اپنے گھر داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ اس کی شادی کے ایک سال پہلے

کی بات ہے۔ میں آپ کو سچی بات بتادوں؟..... عائشہ عورت نہیں، بڑی خوبصورت چڑیل ہے۔ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔"

"رحمت کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟"

"خدا جانتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "گاؤں کے کسی اور مرد یا عورت کا بھید پوچھ لو۔ پیٹ کے بھید بھی بتادوں گی لیکن عائشہ کے متعلق کچھ نہ پوچھو۔ بہت گہری لڑکی ہے۔ رحمت اس کے ساتھ شادی ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن میں عائشہ کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی۔"

اس نے جس صاحب اولاد کا نام لیا تھا کہ وہ عائشہ کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا تھا اس کے متعلق پتہ چلا کہ چھ مہینے گزرے، مرگیا ہے۔ میرے سامنے اب پھر اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک رومال، ایک عورت کے چند ایک بال اور رحمت کے پاؤں کا نشان تھا۔ مگر یہ کھرا مجھے تفتیش میں مدد دے سکتا تھا عدالت میں نہیں۔ میں نے قدیر اور اس کی بیوی کے قریبی رشتہ دار مردوں کی فہرست تیار کی۔ مجھے شک تھا کہ ان میں سے کسی نے اسی شک یا یقین پر رحمت کو قتل کیا ہے کہ اس نے قدیر کو زہر دیا ہے۔

# ایک اور قتل

میں تفتیش کی نئی لائن بنا رہا تھا کہ صبح کے وقت ایک شاہ جی، نمبردار اور دو اور آدمی تھانے میں آئے۔ انہوں نے رپورٹ درج کرائی کہ شاہ کا بیٹا جس کی عمر بائیس تئیس سال تھی، کھیتوں میں مرا پڑا ہے۔ وہ سب بہت ڈرے ہوئے تھے۔ پہلے قدیر مرا۔ دو روز بعد رحمت مرگیا اور اس کے دو روز بعد شاہ کا بیٹا مرگیا۔ ایک آدمی نے ہاتھ جوڑ کر

روہانسی آواز میں کہا۔ "حضور، یہ کوئی شریر شرارہ معلوم ہوتا ہے ورنہ اِن (شاہ جی) بادشاہوں کی اولاد پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔"

مجھے اس شاہ سے اور اس جیسے ہر ایک شاہ سے نفرت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو میری تعلیم ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جتنی حقیقتیں میں نے دیکھی ہیں (یا پولیس انسپکٹر دیکھا کرتے ہیں) ان کے سامنے شاہوں اور پیروں کے تعویذ اور کالے جادو محض فراڈ ہیں۔ لوگ بے چارے اَن پڑھ اور توہم پرست ہوتے ہیں، ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اب یہ شاہ اپنے بیٹے کے قتل کی رپورٹ درج کرانے آیا تو میں نے بے اختیار اُسے کہا۔ "شاہ صاحب، آپ تو زمین اور آسمان کا حال جانتے ہیں۔ جِن اور چڑیلیں آپ کے قبضے میں ہیں۔ اپنے بیٹے کے قاتل کے متعلق آپ کچھ نہیں جانتے؟"

چونکہ شاہ کے ساتھ نمبردار اور گاؤں کے دو آدمی تھے اس لیے ان پر رعب جمانے کے لیے اُس نے غصے سے جھوم کر کہا۔ "اگر میرے بیٹے کا قاتل کوئی جِن ہوا یا کوئی چڑیل ہوئی تو دیکھنا چوہدری، ساری دنیا کے سامنے اس کے سارے خاندان کو جلا دوں گا۔"

میں نے اس دوران قدیر کی بیوی کو آزاد رکھا۔ اس کے گھر نہ خود گیا نہ کسی کو بلایا۔ اب مجھے شاہ کے بیٹے کی موت کی اطلاع ملی تو میں ان کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچا۔ شاہ کا مکان قدیر کے گاؤں سے کوئی اڑھائی یا تین فرلانگ دُور تھا۔ مکان کے آگے اس نے باغیچہ بنا رکھا تھا۔ جناب بڑی شان سے الگ تھلگ جاگیر میں رہتے تھے۔ اس کے مکان اور قدیر کے گاؤں کے درمیان کھیت اور درخت تھے۔ اس کے بیٹے کی لاش ان کھیتوں میں پڑی تھی۔ رات کے پچھلے پہر آندھی چلی اور تھوڑی سی بارش بھی ہوئی تھی جس سے یہ نقصان ہوا کہ کُھرے ضائع ہو گئے تھے۔ لاش ایک مینڈھ پر پڑی تھی۔ منہ کُھلا ہوا، زبان باہر

آئی ہوئی، آنکھوں کے ڈھیلے باہر آئے ہوئے، مٹھیاں بھینچی ہوئیں اور وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ میں نے گردن کو غور سے دیکھا۔ اس کا گلا ہاتھوں سے گھونٹا گیا تھا۔

میں نے سب کو وہاں سے دور چلے جانے کو کہا۔ میرا اپنا ایک طریقۂ کار تھا۔ موقعۂ واردات سے بعض اوقات کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو دوسروں کو نظر بھی نہیں آتی اور اگر نظر آجائے تو شہری اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ پولیس کے لیے ایسی چیزیں بہت ہی اہم ہوتی ہیں۔ ایسی چیزیں تماشائیوں کی نظروں سے اوجھل ہی رکھی جائیں تو زیادہ فائدہ مند ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تماشائیوں میں قاتل بھی موجود ہو۔ اسی لیے میں نے سب کو دور چلے جانے کو کہا اور خود لاش کے ارد گرد کی زمین دیکھنے لگا۔

کوئی کھرا صاف تو نہیں تھا لیکن زمین صاف بتا رہی تھی کہ یہاں قاتل اور مقتول میں خاصی دھینگا مشتی ہوئی ہے اور مقتول قاتل کے ہاتھوں میں تڑپ تڑپ کر مرا ہے۔ سورج نکل آیا تھا۔ زمین پر کوئی چیز دھوپ میں چمکی۔ میں نے بیٹھ کر دیکھا۔ یہ چھوٹا سا ایک موتی تھا جو عورتوں کے کانوں میں ڈالنے والے کانٹوں میں لگا ہوتا ہے۔ یہ زیور میں جڑا ہوتا ہے۔ میں نے یہ موتی یا اسے آپ نگ کہہ لیں، اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

کام کی ایک چیز اور مل گئی۔ مقتول کی مٹھیاں بند تھیں۔ دونوں مٹھیوں میں کسی عورت کے لمبے لمبے بال تھے۔ ایک مٹھی میں تین بال تھے اور دوسری میں پانچ بال۔ کچھ بال بہت لمبے تھے اور کچھ ٹوٹے ہوئے۔ یہ مٹھیوں میں تھے اور انگلیوں کے درمیان سے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں نے بال مٹھیوں میں سے نکال لیے۔ انہیں اپنی انگلی پر لپیٹ کر گچھا بنایا اور جیب میں ڈال لیا۔ وہاں کے تین آدمیوں کے ابتدائی اور رسمی بیان قلم بند کیے۔ انگوٹھے لگوائے اور لاش چارپائی پر ڈلوا کر سول ہسپتال بھیج دی۔ ایک کانسٹیبل ساتھ

بھیج دیا اور میں خود شاہ کے ڈیرے پر چلا گیا۔ اسے الگ بٹھا کر پوچھا کہ اسے کسی پر شک ہے؟
اس نے ایک پیر کا نام لیا جو وہاں سے تین میل دُور رہتا تھا۔ کہنے لگا۔ "وہ میری شہرت اور میری کرامات سے جلتا ہے۔ مجھے اس پر شک ہے۔ اسے تھانے بلا کر بھینٹی چڑھاؤ۔"

"کوئی اور بات کرو شاہ صاحب"۔ میں نے اسے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اپنے بیٹے کے قتل کی باتیں کرو۔ کاروباری حسد کی باتیں چھوڑ دو۔ میں جو پوچھتا ہوں وہ صاف صاف بتاؤ۔ رات کو آپ کے ہاں کون کون سی عورت آئی تھی؟"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اُوپر وجد طاری کر کے کہا۔ "یہاں تو ساری دنیا آتی ہے"۔

"میں پوچھتا ہوں عورت کون کون سی آئی تھی؟" میں نے ذرا رعب سے پوچھا۔ مگر وہ اپنے آپ کو دیہاتیوں کا روحانی بادشاہ بلکہ خدا سمجھتا تھا، اس نے رعب کے جواب میں رعب سے مجھ سے پوچھا۔ "تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھتے ہو؟ عورت کوئی بھی آئی ہو تمہیں اس سے کیا؟ تم تفتیش کر کے بتاؤ کہ میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"تمہارے بیٹے کو ایک عورت نے قتل کیا ہے"۔ میں نے غصہ پی کر اطمینان سے کہا۔ میں نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ کوئی مجھے گالی بھی دے، میں غصہ پی جایا کرتا تھا۔ اکثر تھانیدار خودسر قسم کے گواہوں اور ملزموں پر تشدد شروع کر دیتے ہیں اور تفتیش سے توجہ ہٹا کر لوگوں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم تھانیدار ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انہیں بھی کوئی تعاون نہیں کرتا۔ میں نے شاہ کا رعب پی لیا اور کہا۔ "تمہارے بیٹے کو ایک

عورت نے قتل کیا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" اُس نے پوچھا۔

"جس پر جناب کی بھی نظرِ کرم تھی اور جناب کے بیٹے کی بھی۔" میں نے کہا۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے کچھ بولنے لگا تو میں نے ذرا دبدبے سے کہا۔ "دیکھو شاہ، میں چاہوں تو تمہیں ہی اپنے بیٹے کے قتل کے شبے میں باندھ سکتا ہوں۔ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے۔ یہ تمہارا نہیں، گورنمنٹ کا کیس ہے۔" میں نے اسے آپ کہنا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا۔ "تمہارے بیٹے کے قتل کا باعث تمہارے گھر میں تھا اور وہ تمہاری نظر میں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ڈیرے میں جو عورتیں یا جوان لڑکیاں آتی ہیں اور جن کو تم خراب کرتے رہتے ہو ان میں کوئی ایسی ہے جس کے متعلق تم یہ کہہ سکو کہ اخلاق کی بہت پکی ہے؟"

"تم مجھ پر غلط الزام نہ لگاؤ۔" اس نے ذرا دبی زبان میں کہا۔

# بال ایک چڑیل کے

اس کا رعب مر گیا تھا لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھا کہ وہ عورتوں کو خراب کرتا ہے۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ شاہ کے بیٹے نے کسی عورت پر ہاتھ ڈالا ہے اور اس عورت نے اسے ختم کر دیا ہے۔ اس کی مٹھی میں عورت کے بال اور لاش کے قریب کانٹے کا موتی بتا رہا تھا کہ قاتل عورت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قاتل کوئی مرد ہو۔ شاہ کے بیٹے نے اس عورت کو پکڑ رکھا ہو گا اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا اس نے شاہ کے بیٹے کا گلا گھونٹ کر مار دیا ہو گا۔ یہ آدمی اس عورت کا بھائی یا خاوند ہو سکتا تھا۔

میں اس سوچ سے پریشان ہونے لگا کہ دیہات کے یہ گنوار لوگ شاہوں اور پیروں کو تو خدا کے بعد کا درجہ دیتے ہیں۔ اپنی بہو بیٹیوں کو اکیلے ان کے ڈیروں پر بھیج دیتے ہیں۔ ان میں ایسا جرأت والا کون ہے جس نے شاہ کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے؟ ۔۔ میرا دماغ مجھے بار بار قدیر کی بیوی کی طرف لے جاتا تھا۔ میں نے اس کے گھر پوچھ گچھ کے دوران اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کا ردِّ عمل دیکھا تھا۔ پھر اس عورت نے بھی اس کے متعلق بتایا تھا کہ عائشہ خوبصورت چڑیل ہے۔ اس کے اندر زہر بھرا ہُوا ہے۔

"قدیر کی بیوی عائشہ تمہارے پاس آتی ہے؟" میں نے شاہ سے پوچھا۔

"کبھی کبھی"

"رات آئی تھی؟"

وہ جھینپ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کا بدلہ ہُوا ڈھنگ دیکھ کر کہا۔" میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اپنے بیٹے کے قاتل کو پھانسی چڑھانا چاہتے ہو تو دل کی ساری باتیں میرے آگے رکھ دو۔ تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے دوسرے لوگوں سے تمام باتوں کا علم ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں اپنے بیٹے کے قتل کے شُبے میں گرفتار کر لوں گا۔ تمہاری پیری مریدی بالکل ختم ہو جائے گی۔ شہادت کو چھپانا جرم میں اعانت کے برابر ہوتا ہے۔ یہ جرم قتل کا ہے۔ قتل میں اعانت کی سزا عمر قید بھی ہو سکتی ہے۔ اپنے جنّوں چڑیلوں کو ذرا بھول جاؤ۔۔۔۔ رات عائشہ تمہارے پاس آئی تھی؟"

"نہیں"

"دن کے وقت آئی تھی؟"

"ہاں"

"تم نے اسے رات کو آنے کے لیے کہا تھا؟" مَیں نے ایک شک کے تحت پوچھا۔

"کہا تو تھا" وہ پھر جھجک گیا" لیکن ..... وہ" یہ کہ کر وہ عجیب سی طرح ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔۔۔ "وہ بڑی اکھڑ طبیعت کی ہے"۔

مَیں ساری بات سمجھ گیا۔ میرے لیے اتنا ہی فقرہ کافی تھا۔ مَیں نے کہا ۔۔ "تم نے اسے کہا تھا کہ رات کو آنا تعویذ دُوں گا"۔

"کہا تو یہی تھا" اس نے کہا۔

"وہ تعویذ کیوں لینے آئی تھی؟"

"اس کا خاوند مارا گیا ہے۔ مجھے صرف اتنا ہی کہتی تھی کہ شاہ جی دعا کرو خدا میری مشکلیں آسان کرے۔ مَیں بہت بڑے چکر میں آگئی ہُوں"۔

## تیسرا موتی میری جیب میں تھا

میں نے یہاں پہنچکر اس سے کچھ بڑی ہی ننگی باتیں پوچھیں۔ شاہ نے مجھے یقین دلا دیا کہ عائشہ اس کے ہاتھ نہیں چڑھی تھی۔ وہ اپنا جسم دینے کو کبھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ میں یہی سُننا چاہتا تھا۔ مَیں وہیں سے قدیر کے گھر چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خدا نے مجھے اندھیرے میں روشنی دکھا دی ہے۔ قدیر کے گھر جا کر مَیں نے قدیر کی بیوی کو اندر اپنے پاس بیٹھا لیا۔ اس کے چہرے پر صاف تبدیلی تھی۔ گھبراہٹ اور ڈر کا اثر صاف تھا، لیکن وہ مجھے پہلے سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی اور اب مجھے پتہ چلا کہ اس کے حُسن کی اصلیت کیا ہے۔ یہ اس کے اندر کا حُسن تھا۔ مَیں نے اسے بہت

تسلّی دی اور کہا کہ جو کچھ پوچھوں وہ صاف صاف بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دوں گا۔ اب کوئی بات چھپا بھی نہیں سکو گی۔

"پوچھو چوہدری جی" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"رات کو تم شاہ کے گھر کیوں نہیں گئی تھی؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے کانوں میں سونے کے کانٹے تھے۔ میں نے دونوں کانٹے غور سے دیکھے۔ ایک میں تین باریک سفید موتی مثلث میں جڑے ہوئے تھے۔ دوسرے میں دو موتی تھے۔ تیسرے کی جگہ خالی تھی۔ یہ موتی میری جیب میں تھا اور وہ رومال بھی میری جیب میں تھا جو رحمت کی لاش کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے کونے میں بال بندھے ہوئے تھے۔ اور جو بال شاہ کے بیٹے کی مٹھیوں سے نکالے تھے وہ بھی جیب میں تھے۔

"عائشہ" میں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "تم راستے سے واپس آگئی تھی"

اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔

"میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ گھبراؤ نہیں" میں نے اسے پھر تسلی دی "میں مسلمان ہوں۔ ہندو یا سکھ نہیں"

مگر وہ بگڑ گئی۔ پختہ آواز میں بولی "میں رات کہیں نہیں گئی تھی"

"تم رات گئی تھی" میں نے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم واپس کہاں سے آئی تھی"

"کہاں سے؟"

"جہاں تم اپنے کانٹے کا یہ نگ پھینک آئی تھی۔" میں نے جیب سے سفید موتی نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور اسے دکھایا۔ "بائیں کان والا کانٹا اتار کر دیکھو۔"

اس نے تیزی سے اپنا کانٹا اتارا۔ دیکھ کر اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

میں نے جیب سے وہ رومال نکالا جو رحمت کی لاش سے برآمد ہوا تھا۔ اس کی گانٹھ کھولی۔ رومال اور بالوں کا گچھا اس کے آگے کر دیا۔ اُس نے نہایت آہستہ آہستہ ہاتھ آگے کیا اور رومال پر رکھ دیا۔ دھیمی سی آواز سے پوچھا — "یہ آپ کو کہاں سے ملا؟" — اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"رحمت کی جیب میں تھا۔"

وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں جان گیا کہ وہ چیخیں مار کر رونا چاہتی ہے۔ وہ عورت تھی۔ عورت مرد سے زیادہ دلیر ہو سکتی ہے لیکن جذبات کی کچی ہوتی ہے۔ میں نے جیب سے دوسرے بال نکالے اور کہا — "یہ بال بھی تمہارے ہیں۔ شاہ کے بیٹے کی لاش کی مٹھیوں میں تھے۔ یہ بال بھی تمہارے ہیں جو رحمت نے رومال میں باندھ رکھے تھے۔ تمہارے خاوند کو رحمت نے زہر دیا تھا" — مجھے ابھی بالکل یقین نہیں تھا کہ یہ بال اسی کے ہیں۔

اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر ساکن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی ادھر دیکھتی کبھی دوسری طرف سر گھما لیتی۔ وہ سخت بے چین ہو گئی تھی۔ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے وہ بھاگ جانا چاہتی ہو۔ میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور کھینچ کر بٹھایا مگر وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اچانک چلا کر کہا۔ "تم مرد کتے ہو۔ رحمت بھی کتا تھا۔ شاہ کا بیٹا بھی کتا تھا۔ شاہ بھی کتا ہے۔"

میں نے اُٹھ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔ "اور میں تمہارا بھائی ہوں۔"

اُس نے چہرہ میرے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی اور کہا — "میرا کوئی بھائی نہیں"۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر زور سے دھکا دیا اور خود دھڑام سے فرش پر بیٹھ گئی۔ بولی "پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ میں سُولی پر چڑھنے کے لیے تیار ہوں" — اس نے فرش پر زور زور سے ہاتھ مار مار کر کہا — "سُن لے۔ رحمت کو مَیں نے قتل کیا ہے۔ شاہ کے بیٹے کو مَیں نے قتل کیا ہے۔ بتا اور کیا پوچھتا ہے تُو؟"

# ....اور دل کے زخم

اُس وقت وہ اتنے زیادہ قہر اور غصے میں تھی کہ مجھے شک ہوا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اس کے دانت اس طرح دکھائی دینے لگے جیسے کوئی خوبصورت چڑیل ہو۔ مَیں نے بڑی ہی مشکل سے اُسے ٹھنڈا کیا اور اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ آرام سے بات کرے، مَیں اس کی مدد کروں گا اس پر وہ رونے لگی۔

اس نے جو لمبا چوڑا اقبالِ جرم کیا وہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے کہ وہ شریف ماں باپ کی بیٹی تھی۔ جوان ہوئی تو اسے رحمت اچھا لگنے لگا۔ رحمت نے بھی اسے دل و جان سے چاہا۔ اس نے قسمیں کھا کر بتایا کہ اُن کی محبت پاک تھی۔ رحمت نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے گا، لیکن اس کے ماں باپ نہ مانے۔ عائشہ کا رشتہ قدیر کے ساتھ طے ہو گیا۔ رحمت نے اسے کہا کہ گھر سے بھاگ چلتے ہیں لیکن عائشہ نہ مانی۔ اس نے اسے کہا کہ ماں باپ نے معلوم نہیں کیسی کیسی امیدوں سے پالا ہے، مَیں ماں باپ کی عزت گاؤں میں خراب نہیں کروں گی۔ تم اپنے ماں باپ کو راضی کر دو

میں اپنے ماں باپ کو راضی کروں گی۔ رحمت کے ماں باپ راضی نہ ہوئے تو عائشہ نے اپنی ماں سے بات تک نہ کی کہ وہ رحمت کو پسند کرتی ہے۔ اس کی شادی قدیر کے ساتھ ہو گئی۔

"قدیر کے ساتھ شادی کر کے میرا دل زخمی ہو گیا۔" عائشہ نے مجھے سُنایا۔ "لیکن میں نے باپ کی پگڑی کو داغ نہ لگنے دیا۔ اُف تک نہ کی۔ لڑکیاں ڈولی میں بیٹھ کر روتی ہیں۔ میں روئی بھی نہیں۔ جب سسرال سے واپس آئی تو سہیلیوں نے مجھ سے مذاق کیے تھے کہ قدیر تجھے اتنا اچھا لگا تھا کہ میکہ گھر اور گاؤں چھوڑتے تیری آنکھ میں آنسو بھی نہ آیا۔ میں ہنستی رہی مگر میرے دل کے زخموں کو نہ کوئی دیکھ سکا نہ میں نے کسی کو دکھایا۔ مجھے قدیر اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے صرف رحمت اچھا لگتا تھا۔ شادی سے دو روز پہلے رحمت نے مجھے کہا تھا کہ اپنی کوئی نشانی دے جاؤ۔ میں نے پوچھا کہ اسے کیا پسند ہے۔ اس نے کہا کہ سر کے بال دے جاؤ۔ میں نے اپنے سر کے تھوڑے سے بال ریشمی رومال میں لپیٹ کر دے دیئے۔ میں نے قدیر کو کبھی پتہ نہ چلنے دیا کہ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔ کبھی لڑی جھگڑی نہیں تھی۔ یہ اس کا باپ اور بہن باہر بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لو۔ میرے ساتھ شادی کر کے قدیر نے کوئی قصور تو نہیں کیا تھا۔ میں اسے یا اس کے باپ اور بہن کو کیوں پریشان کرتی؟"

ان لوگوں نے اپنا گھر عائشہ کے حوالے کر دیا تھا اور گھر کی مختار وہی تھی۔ اس دوران وہ میکے جاتی تو رحمت کے گھر ضرور جاتی۔ سارا سارا دن وہاں رہتی اور کبھی کبھی رحمت سے اکیلے بھی ملتی۔ رحمت اسے بار بار کہتا کہ چلو بھاگ چلیں لیکن عائشہ نہ مانی۔ اس نے رحمت سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر تمہارے ماں باپ مان جاتے ہیں تو قدیر سے طلاق لے لیتی ہوں۔ رحمت نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اس نے دو رشتے ٹھکرا دیئے۔ وقت گزرتے گزرتے

آٹھ مہینے گزر گئے۔ رحمت نے عائشہ کو ایک دن کہا کہ وہ قدیر کو راستے سے ہٹائے گا پھر ماں باپ کو عائشہ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے رضامند کرے گا۔ عائشہ نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔ وہ سمجھی کہ وہ قدیر کو طلاق پر راضی کرے گا بلکہ بعد میں وہ اس کی اس بات کو مذاق سمجھتی رہی۔

تین روز بعد قدیر اس حالت میں گھر آیا کہ ایک ہاتھ پیٹ پر اور دوسرا سینے پر رکھا تھا۔ ناک سے خون نکل رہا تھا۔ وہ کسی کو کچھ نہ بتا سکا۔ صحن میں آکر گرا اور مر گیا۔

عائشہ نے کہا۔ "جب وہ گرا تو مجھے فوراً رحمت کی بات یاد آئی کہ میں قدیر کو راستے سے ہٹا دوں گا۔ اُس وقت مجھے سمجھ آئی کہ اس نے کیا کہا تھا۔ قدیر کو دیکھ کر میرے منہ سے نکلا ہائے اسے تو کسی نے زہر دے دیا ہے۔ مجھے دو آدمیوں پر بھی شک تھا۔ وہ مجھے دس دس روپے کے نوٹ دکھاتے رہتے تھے۔ مجھے پیغام بھی بھیجا کرتے تھے۔ منتیں کرتے اور ساری عمر غلام رہنے کے وعدے کرتے تھے۔ میں جانتی ہوں کہ قدیر کی موت پر یہ سارے آدمی خوش ہوں گے۔ رحمت بھی آیا تھا۔ میں نے اسے مردوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ قدیر مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ میرا خاوند تھا۔ میرے سر کی چادر تھا۔ میری عزت اسی سے تھی۔ میں غصے سے پاگل ہونے لگی۔ رحمت دیر تک باہر مردوں میں بیٹھا رہا۔ میں اسے بار بار دیکھتی رہی۔ وہ جانے کے لیے اُٹھا تو میں چوری چھپے گاؤں سے نکل کر اس کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔ میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ قدیر کو زہر اُس نے دیا ہے یا کسی اور نے۔ وہ مجھے اتنی خوشی سے ملا جیسے ہمارا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ بڑے فخر سے کہنے لگا۔ 'میں نے راستہ صاف کر دیا ہے۔ تیار رہو' — میں نے اسے کہا۔ 'کل ملنا۔ میں آؤں گی' — اور وہ خوش خوش چلا گیا۔"

عائشہ کے دل میں انتقام آگیا۔ وہ دو روز بعد رات گاؤں سے دُور اُس جگہ پہنچی جو اُس نے رحمت کو بتائی تھی۔ رحمت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے جوانمردوں کی طرح گردن تان کر اسے کہا۔ "میں قدیر جیسے دس آدمیوں کو ختم کر سکتا ہوں"۔ اس کے ساتھ ہی اس پر شیطان سوار ہو گیا۔ وہ عائشہ کو کھڑی فصل میں چلنے کو کہنے لگا۔

عائشہ نے مجھے سنایا۔ "میں بدکار نہیں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ جائز طریقے سے شادی کر لو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں خاوند سے طلاق لے لیتی ہوں لیکن اس نے میرے خاوند کو زہر دے دیا اور ابھی اس کی قبر کی مٹی خشک نہیں ہوئی تھی کہ مجھے بدکاری کے لیے کہنے لگا۔ میں بھول گئی کہ اس شخص کو میری روح بھی چاہتی ہے۔ میں نے یہی محسوس کیا کہ وہ مجھے بیوہ سمجھ کر مجھے فصل کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے ہو کر اس کی گردن ہاتھوں میں دبالی۔ اُس نے زور لگایا لیکن میں نے اس کا سانس روک دیا۔ وہ بے بس ہو کر تڑپنے لگا اور گر پڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گئی۔ گردن نہ چھوڑی۔ میرے منہ سے یہی لفظ بار بار نکلتے تھے۔ "تم مرد ہوتے تو بزدل چوروں کی طرح میرے خاوند کو زہر نہ دیتے۔ میں اپنے خاوند کا پورا بدلہ لوں گی"۔ پھر اس کی حرکت ختم ہو گئی۔"

وہ بول رہی تھی اور میں اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی روح کا حُسن اس کے چہرے پر آگیا تھا، اور اب کسی ڈر یا خطرے کے بغیر بول رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ "تمہیں نہیں بتا سکتی کہ میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی اور میری عقل پر کس شر شرار کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس کی جان نکل گئی تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا اور نہ مجھے ڈر لگا کہ پکڑی جاؤں گی۔ میں اور زیادہ دلیر ہو گئی۔ میں نے لاش کو کندھے پر ڈال لیا۔ آپ نہیں مانیں گے کہ میں نے اتنے بھاری مرد کو کندھے پر اٹھا لیا ہو گا۔ میں نے اسے اُٹھا لیا

ریل کی لائن بہت دُور نہیں تھی۔ میں نے لاش ایک لائن پر لٹا دی۔ آدھا دھڑ ادھر آدھا اُدھر۔ اور وہاں سے قدیر کی قبر پر چلی گئی۔ قبر پر ہاتھ پھیرتی رہی اور بین کرتی رہی۔ گاؤں کے دو آدمیوں نے میری آواز سُنی تو آ کر مجھے گھیر لے گئے۔"

## میں قانون کا غلام وہ دوہرے قتل کی مجرم

عائشہ کو چند اور آدمی بھی پھانسنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ سب کو نفرت سے دھتکار چکی تھی۔ اس کا خاوند مارا گیا اور جسے وہ چاہتی تھی اسے اس نے اپنے ہاتھوں مار دیا تو اس کی دماغی حالت اس کے قابو سے باہر ہونے لگی۔ اس سے پہلے وہ دو مرتبہ شاہ کے گھر سلام کے لیے گئی تھی۔ اب وہ بہت پریشان ہوئی تو پھر شاہ کے پاس گئی اور اسے کہا کہ وہ اس کے لیے دُعا کرے کہ خدا اس کی مشکلیں آسان کر دے۔

اسی روز وہ شاہ کے گھر سے واپس آئی تو شاہ کا بیٹا اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ عائشہ بھی دیہات کی دوسری عورتوں کی طرح اس کا احترام کرے گی اور وہ جو چاہے گا وہ کر گزرے گی۔ عائشہ نے اسے بھی کھری کھری سنا دیں۔ وہ دوسرے دن پھر شاہ کے پاس گئی تو شاہ نے اسے رات کو بلایا اور کہا کہ وہ جو تعویذ دے گا وہ رات کو لکھا جاتا ہے۔ عائشہ جھانسے میں آ گئی۔ اگر وہ شاہ تک رات کو پہنچ جاتی تو شاہ نہیں تھا یا عائشہ کی عزت نہیں تھی۔ ہُوا یوں کہ شاہ کا بیٹا بھی سُن رہا تھا کہ عائشہ کو باپ نے رات کو بلایا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب عائشہ رات کے وقت شاہ کے گھر کی طرف جا رہی تھی اس کا بیٹا اسے راستے میں مل گیا۔ اس نے اس پر اپنی خبیث نیّت کا اظہار کیا۔

عائشہ نے اسے سختی سے منع کیا تو شاہ کا بیٹا اپنی مردانگی کا رعب جمانے لگا۔

عائشہ نے اس کے منہ پہ تھپڑ مارا۔ شاہ کے بیٹے نے ایک ہاتھ عائشہ کے دائیں کان پر رکھا، دوسرا بائیں کان پر اور اس طرح اس کے سر کو جکڑ کر اپنا منہ اس کے منہ کی طرف لے جانے لگا۔ عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی اور دونوں انگوٹھے شاہ رگ کے دائیں بائیں رکھ کر پورے زور سے دبائے۔ شاہ نے عائشہ کے بال مٹھیوں میں پکڑ کر کھینچے اور اس کے ہاتھوں میں اس کا ایک کانٹا بھی آ گیا ہوگا جس کا ایک موتی نکل کر گر پڑا۔ عائشہ نے اس کی گردن کو اور زیادہ دبایا۔ شاہ کا بیٹا بہت تڑپا لیکن عائشہ اپنی عزت کی خاطر چڑیل بن چکی تھی۔ اس نے اسے جان سے مار کر ہی دم لیا۔ وہ گرا تو عائشہ کے کئی بال اس کی مٹھیوں میں چلے گئے۔ عائشہ شاہ کے گھر نہ گئی۔ وہیں سے واپس آ گئی۔

"میں اس کے گھر اس لیے نہ گئی کہ مجھے اس کی بھی نیت پر شک ہو گیا تھا" عائشہ نے کہا۔ "معلوم نہیں مجھے یہ عقل کس نے دی کہ شاہ جو تعویذ رات کو دے گا وہ دن کے وقت بھی دے سکتا ہے۔ مجھے اس کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ میں اس کے پاس جاتی تھی تو مجھے باؤلے کتوں کی طرح دیکھتا تھا۔"

عائشہ نے کہا۔ "اس سے پہلے بھی کئی مرد میرے پیچھے پڑے رہتے تھے لیکن میں نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ مگر میرا خاوند مارا گیا تو میں چڑیل بن گئی۔ میں اپنے خاوند سے شرمسار ہوں کہ اس کی زندگی میں ایک غیر مرد کو دل میں بٹھائے رکھا لیکن میرا خدا خود ہی گواہی دے گا کہ میرے اس جسم کا مالک میرا خاوند تھا۔ یہ جسم اُسے بھی نہیں دیا جسے میں دل سے چاہتی تھی۔"

اُس وقت عائشہ کا حسن دیکھنے والا تھا۔ مجھے اس سوال کا جواب مل گیا کہ اس لڑکی

میں وہ کیا کشش ہے جس نے میری تھانیداری کو بھی ہلا دیا تھا۔ یہ رُوح کا حُسن تھا اور یہ دل کی پاکیزگی تھی جو اس کی آنکھوں میں چمکتی تھی اور جو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر کھلی رہتی تھی۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ احترام سے اس کے سر کو چوم لوں جسے پاک رکھنے کے لیے اس نے دو مردوں کی گردنیں مروڑ دی تھیں۔

میں جب تھانے گیا تو میں نے اس کے اُن بالوں کو چوہا جو شاہ کے بیٹے کی مٹھی سے نکالے تھے اور انہیں بھی جو رحمت کی لاش کی جیب سے برآمد ہوئے تھے، مگر عائشہ نے مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا۔ قانون کی نگاہ میں وہ دوہرے قتل کی مجرم تھی لیکن میری نگاہ میں اس کا رتبہ کچھ اور تھا۔ میں قانون کا غلام تھا۔ تین آدمی قتل ہو گئے تھے۔ مجھے استغاثہ مضبوط بنانا تھا مگر میرے اندر اس لڑکی کا ایک مسلمان بھائی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی کو سزا ہو۔ مجھے لڑکی کو حراست میں ضرور لینا تھا اور مجسٹریٹ کے پاس لے جا کر اقبالی بیان بھی ریکارڈ کرانا تھا۔

میں عائشہ کو حراست میں لے کر تھانے لے گیا۔ اسے حوالات میں بند کر دیا اور کانسٹیبلوں سے کہا کہ اسے معمولی سی ملزم نہ سمجھیں۔ اسے عزت سے رکھیں۔ اس کے لیے کھانا اپنے گھر سے پکوا کر بھیجا۔ سوچ سوچ کر میرا سر چکرانے لگا۔ شام کو ایک گاڑی ہمارے سٹیشن پر رکتی تھی۔ مجھے ایک سکھ مجسٹریٹ کا خیال آیا۔ میں نے ایک بار اس کا ایک کام کیا تھا۔

میں نے وردی اتاری۔ اپنے کپڑے پہنے اور شام کی گاڑی سے شہر چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کا سفر تھا۔ شہر پہنچا تو اس سکھ مجسٹریٹ کے گھر چلا گیا۔ ہندو بڑی ہی کمینی اور دھوکا باز قوم ہے۔ سکھوں پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ مجسٹریٹ گھر پر مل گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ میں نے اسے عائشہ کی ساری کہانی اور اس کا بیان سُنا دیا اور اسے کہا کہ میں

اسے آپ کے پاس اقبالِ جرم کے لیے لا رہا ہوں مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ سزا سے بچ جائے۔ سکھ سمجھ گیا کہ میری نیت خراب نہیں اور میں لڑکی کی غیرت مندی کی وجہ سے اسے بچانا چاہتا ہوں۔ اس کا طریقہ یہی تھا کہ کچھ گڑبڑ اقبالی بیان میں یہ مجسٹریٹ کر دے اور استغاثہ میں ایک دو کمزوریاں میں خود چھوڑ دوں۔

میں نے مجسٹریٹ سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ اقبالی بیان اتنا کمزور رکھیں کہ مجھ پر کسی کو شک نہ ہو اور عدالت یہ ریمارک نہ دے دے کہ پولیس نے استغاثہ بہت کمزور بنایا ہے" مجسٹریٹ میری بات سمجھ گیا۔ اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرا کام کر دے گا اور لڑکی کو بری ہونے کا موقعہ دے گا۔ رات کی پسنجر ٹرین سے میں واپس آیا۔ میں نے عائشہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے وہ رات آج بھی یاد ہے۔ میں ساری رات نہ سویا۔ سوچتا رہا۔ کروٹیں بدلتا رہا اور صبح ہو گئی۔ عائشہ کو حوالات سے نکالا۔ اسے ناشتہ کروایا۔ منہ ہاتھ دھلایا اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر عائشہ کو ریلوے سٹیشن پر لے گیا۔ یہ گاڑی بھی ہمارے سٹیشن پر رکتی تھی۔

میں عائشہ کو مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان کے لیے لے گیا۔ مجسٹریٹ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ کچھ کمزوریاں اقبالی بیان میں ڈال دیں۔ کچھ گڑبڑ میں نے اپنے استغاثہ میں کی لیکن ہم دونوں عائشہ کو عمر قید سے نہ بچا سکے اور وہ اپیل میں بھی بری نہ ہو سکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عائشہ سیشن کورٹ میں جا کر بھی اپنے اقبالی بیان سے منحرف نہیں ہوئی تھی۔

# جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے،

مَیں نے اُسے کہا۔ "پہلے مجھے لڑکی دکھا دو۔ ہو سکتا ہے یہ وہ لڑکی نہ ہو جسے مَیں ڈھونڈ رہا ہوں۔"

اُس نے جواب دیا۔ "یہ وہی لڑکی ہے جس نے کوٹھی میں ایک شہری بدمعاش کو قتل کیا ہے۔ یہ لڑکی جوان، خوبصورت اور کنواری ہے۔"

میں نے پچھلی کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ پولیس کا ریکارڈ دیکھیں تو آپ کو کئی ایک ناقابلِ یقین اور ان ہونے واقعات نظر آئیں گے جیسے پولیس کے کسی زرخیز دماغ تھانیدار نے کہانیاں گھڑلی ہوں یا کوئی افسانہ نویس الف لیلٰے کی نقل مار تا رہا ہو۔ لیکن پولیس والوں کے لیے کوئی واردات حیران کن نہیں ہوتی۔ انسانی فطرت بڑا ہی گہرا اور بہت ہی وسیع سمندر ہے۔ اس سمندر میں کیا کچھ چھپا ہُوا ہے؟ یہ آپ کو علمِ نفسات کا کوئی تجربہ کار ڈاکٹر بتا سکتا ہے یا وہ پولیس انسپکٹر جو تفتیش میں دیانت دار، محنتی اور مخلص ہو۔

یہ واردات جو مَیں آپ کو سُنانے لگا ہوں ایسی ہی وارداتوں میں سے ایک ہے جو ہر اُس شہری کے لیے اگر ناقابلِ یقین نہیں تو حیران کُن ضرور ہو گی جو انسانی فطرت کو نہیں سمجھتا۔ میری کہانیاں پڑھتے وقت یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھیں کہ مَیں واردات کے شہروں، قصبوں، دیہات اور کرداروں کے نام نہیں لکھا کرتا۔ کبھی سہولت کے لیے کرداروں کے جو نام لکھتا ہوں وہ صحیح نہیں ہوتے۔ اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ متعدد متعلقہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان میں آ گئے تھے اور یہاں باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں

ان کی توہین کا باعث نہیں بننا چاہتا۔

شہر سے ذرا باہر کھلے علاقے میں ایک سکھ تاجر نے کوٹھی بنوائی جو ابھی غیر آباد تھی۔ اس کے سامنے ابھی ریت، سیمنٹ اور مٹی وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔ ایک صبح اطلاع ملی کہ اس کوٹھی کے برآمدے میں ایک لاش پڑی ہے۔ میں ضروری عملے کو ساتھ لے کر پہنچا۔ بڑا اچھا اتفاق تھا کہ گشت والا کانسٹیبل کہیں قریب تھا۔ اُس نے عقلمندی کی کہ کوٹھی کے دونوں پھاٹک بند کر دیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو تماشائی اندر جا کر کھُرے (پاؤں کے نشان) تباہ کر دیتے۔ اس طرح سراغرسانی میں بہت دشواری پیدا ہو جاتی۔

میں پھاٹک میں داخل ہوا تو ریت، سیمنٹ اور مٹی پر کھُرے واضح تھے۔ کھوجی بلوایا اور خود ان کھُروں سے بچتا اندر گیا۔ لاش دروازے میں پڑی تھی۔ سر سے کولہوں تک برآمدے میں اور ٹانگیں کمرے میں۔ خون بہہ کر برآمدے سے بھی باہر چلا گیا تھا۔ یہ پینتیس سال کے لگ بھگ عمر کا ایک مسلمان تھا۔ خاصا خوبرو آدمی تھا۔ کمرے میں لاش کے پاؤں کے قریب ایک چھُری پڑی تھی جو قصاب استعمال کرتے ہیں اور گھروں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس چھُری کے دو زخم لاش کے پیٹ میں تھے اور ایک سینے میں۔ لاش کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر چھُری کا گہرا کٹ تھا جو ظاہر کرتا تھا کہ مقتول کے پیٹ میں چھُری گئی تو اُس نے چھُری پکڑی۔ قاتل نے چھُری کھینچی تو مقتول کا ہاتھ کٹ گیا۔

کھوجی کے آنے تک میں نے کھُروں کی طرف توجہ نہ دی۔ جائے واردات کو غور سے دیکھنے لگا۔ شاید سراغرسانی میں مدد کرنے والی کوئی چیز مل جائے۔ کمرے میں فرش پر کانچ کی دو چوڑیوں کے ٹکڑے ملے۔ جس دروازے میں لاش پڑی تھی اس کے ایک کواڑ کے پچھلی طرف ایک کیل گاڑی گئی تھی، وہ کوئی دو تین سُوتر سامنے سے باہر نکلی ہوئی

تھی۔ اس کے ساتھ باریک سے کپڑے کا ذرا جتنا ٹکڑا اٹکا ہوا تھا۔ یہ بمشکل نصف انچ ہوگا۔ میں نے یہ ٹکڑا کیل سے اتارا اور غور سے دیکھا۔ یہ کسی عورت کے دوپٹے کا تھا جو صاف ظاہر کرتا تھا کہ کوئی عورت اندر سے نکلی تو اس کا دوپٹہ جو ململ اور ریشم سے زیادہ باریک تھا اس کیل میں پھنس گیا۔ عورت نے جلدی میں کھینچا اور یہ ٹکڑا یہیں رہ گیا۔ چوڑیوں کے ٹکڑوں اور دوپٹے کے اس چھوٹے سے ٹکڑے نے یہ وضاحت کر دی کہ مقتول کے ساتھ ایک عورت تھی۔

دو ہی باتیں ہوسکتی تھیں۔ ایک یہ کہ مقتول اس غیر آباد کوٹھی میں اس عورت کو زبردستی بے آبرو کرنے کے لیے لایا تھا اور عورت کے لواحقین بروقت پہنچ گئے یا مقتول کے ساتھ کوئی اور آدمی تھا جس کا مقتول کے ساتھ اس عورت پر جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ جنسی جرائم کے مجرم درندے ہوا کرتے ہیں۔ ایسے مجرموں کے درمیان ایک عورت آجائے تو ان کی حالت کتوں جیسی ہو جاتی ہے مجھے شک ہوا کہ یہ واردات اسی نوعیت کی ہے۔

کھوجی بہت دیر سے آیا۔ میں نے اس دوران لاش کی برآمدگی، اسے اپنے قبضے میں کرنے اور پوسٹمارٹم کے لیے بھیجنے کی کاغذی کارروائی مکمل کر لی۔ جن دو آدمیوں کے میں نے بطور گواہ دستخط لیے ان میں سے ایک نے مقتول کو پہچان لیا۔ مقتول دکاندار تھا۔ اس کی چوڑیوں، سرخی پوڈر، لپ سٹک وغیرہ اور عورتوں کے بناؤ سنگار اور دیگر زنانہ ضروریات کی دکان تھی۔ شکل و صورت سے وہ معمولی قسم کا دکاندار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے گھر کا پتہ بھی مل گیا۔

اتنے میں کھوجی آگیا۔ وہ کم و بیش ساٹھ سال کی عمر کا آدمی تھا۔ اپنے فن میں

جادوگر لگتا تھا۔ بعض اوقات ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے بچپن میں جو کھُرے اپنے باپ کے ساتھ دیکھے تھے وہ ابھی تک اسے یاد ہیں۔ اُس نے کوٹھی کے دونوں پھاٹکوں سے باری باری کوٹھی کے برآمدے تک زمین دیکھی۔ پھر مقتول کی جوُتی کا تلوا دیکھا اور ہر ایک کھُرا مجھے دکھا کر (جن میں سے بعض نظر بھی نہیں آتے تھے) تشریح کی کہ مقتول اس پھاٹک سے اندر گیا۔ عورت اس کے بعد یا اس کے پیچھے پیچھے اسی پھاٹک سے اندر گئی۔ یہ دیکھئے، کھُرے پر کھُرا چڑھا ہوُا ہے۔ مقتول باہر نہیں نکل سکا۔ کمرے میں قتل ہوُا اور دروازے میں گرا۔ پھر دو آدمی دوسرے پھاٹک میں سے اندر گئے۔ عورت برآمدے میں تھی یا کمرے میں۔ پھر یہ عورت ان دو آدمیوں کے ساتھ چلی گئی۔

کھوجی نے واپسی کے کھُرے مجھے دکھا کر کہا۔ "یہ دو آدمی برآمدے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہیں۔ یہ دیکھئے۔ عورت برآمدے سے کچّے پر آئی ہے۔ اب ایک آدمی اس کے دائیں ہے اور دوسرا بائیں۔ عورت اپنی مرضی سے جا رہی ہے۔ اسے کوئی گھسیٹ نہیں رہا۔ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ عورت دانے کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ یہ دو آدمی مقتول کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اسے یہاں لانے کے لیے انہوں نے اسے اس عورت سے پھانسا ہے۔ وہ عورت کے جھانسے میں آگیا اور دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

## عورت کی مرضی کچھ اور تھی

لیکن میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ یہ دو آدمی کون تھے اور یہ عورت کون تھی؟ قتل کا باعث

اور طریقہ معلوم کر لینا ہی کافی نہیں تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور میں کھوجی کو ساتھ لے کر یہ دیکھنے کے لیے باہر نکلا کہ یہ دو آدمی اور عورت کس طرف گئے ہیں تماشائیوں کو ہم نے کوٹھی کے قریب نہیں آنے دیا تھا۔ ارد گرد کا علاقہ کچا تھا۔ کوٹھی کے قریب سے ایک سڑک گزرتی تھی جو شہر میں جاتی تھی۔ کچا علاقہ کھرا اُٹھانے کے لیے بہت اچھا تھا۔ پہلے تو کھوجی سڑک کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف زمین دیکھتا گیا مگر تھوڑی دُور سے واپس آ گیا۔ اُس زمانے میں ٹریفک کا یہ حال نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس اتنی زیادہ کاریں، بسیں اور سکوٹر وغیرہ نہیں تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک پر آ کر اُس نے کھُروں کے رُخ دیکھے تو غیر آباد علاقے کی طرف چل پڑا۔ ڈیڑھ سو گز آگے جا کر سڑک ایک طرف مڑ جاتی تھی۔ وہاں سے اُس نے مجھے آواز دی۔ میں گیا تو اس نے کہا ۔۔۔ "آپ کی تفتیش شہر سے نکل گئی ہے"۔ اُس نے زمین پر چھڑی کا سرا رکھ کر کہا ۔۔۔ "یہ جا رہے ہیں آپ کے ملزم" ۔۔۔ میں نے اس کی ہاں میں ہاں تو ملا دی لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے زمین پر کچھ نظر نہیں آیا۔

وہ مجھے آگے لے گیا۔ یہ علاقہ ویران اور بنجر تھا۔ کچی مٹی، کہیں پتھر کی طرح سخت، کانٹوں والی جھاڑیاں، درخت وغیرہ۔ زیر کاشت کھیت دُور آگے سے شروع ہوتے تھے۔ ہم کوئی بیس قدم آگے گئے تو کھوجی ایک جگہ رُک کر جھک گیا۔ کہنے لگا۔ "عورت اپنی مرضی سے نہیں جا رہی۔ ذرا غور سے دیکھیں، وہ یہاں رُک گئی ہے۔ آدمی اسے کھینچ رہے ہیں۔ یہ کھُرے اس کی مرضی کے نہیں"۔

میں نے دیکھا۔ کھُرے گڈمڈ تھے۔ زنانہ پاؤں بے قاعدہ تھے۔ کھوجی آگے چلتا گیا اور بار بار کہتا رہا۔ "ملک صاحب! معاملہ گڑبڑ ہے۔ عورت کی مرضی کچھ اور ہے"۔

یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ملزموں کے کھُرے بعض اوقات واردات کی کہانی

بیان کر دیا کرتے ہیں لیکن یہ بانی سنانے کے لیے ماہر کھوجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں آپ کو تفصیلات نہیں سنا سکتا کیونکہ یہ بہت لمبی ہیں۔ آپ بور ہو جائیں گے۔ اگر آپ کسی کھوجی کے ساتھ کھرا اٹھاتے ہوئے چلیں تو وہ اس طرح کھرے بیان کرتا جائے گا جیسے وہ ملزموں کی حرکات اور چال دیکھ رہا ہے اور آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہے۔ کھوجی مجھے بتا رہا تھا کہ عورت کو زبردستی سے جایا جا رہا ہے۔ مجھے کچھ بجھے بجھے، ادھورے ادھورے اور کچھ نمایاں کھرے نظر آ رہے تھے۔

ہم اور دُور نکل گئے۔ کھرے ہمیں عام راستے سے ہٹا کر ویران علاقے میں لے گئے تھے۔ میں نے ایک جگہ رُک کر آگے دیکھا تو تقریباً پچاس قدم دُور ایک جھاڑی کے ساتھ اُلجھا ہوا کپڑا مجھے نظر آیا۔ میں دوڑ کر وہاں پہنچا۔ کانٹوں والی ایک جھاڑی کے ساتھ چار جٹ کا ایک دوپٹہ اُلجھا ہوا تھا۔ اس پر خون کے دھبے تھے اور خون میں بھیگا ہوا پورا ہاتھ لگا ہوا تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ مقتول نے اپنا یہ ہاتھ پیٹ کے زخم پر رکھا پھر عورت کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ عورت کی پیٹھ پر پڑا۔ خون آلود ہاتھ کا پورا نشان دوپٹے پر لگا اور عورت بھاگ گئی۔

اس دوپٹے کا رنگ فیروزی تھا۔ میں نے جیب سے وہ ذرا سا ٹکڑا نکالا جو دروازے سے نکلی ہوئی کیل کے ساتھ اٹکا ہوا تھا۔ دوپٹے سے ملایا۔ یہ اسی دوپٹے کا ٹکڑا تھا۔ میں نے دوپٹے کو دیکھا۔ ایک جگہ سے ٹکڑا غائب تھا اور دھاگے کھچے ہوئے تھے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ یہ دوپٹہ اسی عورت کا ہے جو غیر آباد کوٹھی میں مقتول کے ساتھ تھی۔

باقی کہانی کھوجی نے بیان کر دی۔ اُس نے زمین پر جھک کر دیکھا۔ ایک تو اُس نے ایک چوڑی کے تین ٹکڑے اُٹھا کے مجھے دیئے۔ میں نے انہیں ملایا تو پوری چوڑی بن گئی۔ اس

چوڑی کا رنگ اور ڈیزائن وہی تھا جو جائے واردات سے برآمد ہونے والی چوڑیوں کا تھا۔ وہاں کھُرے بُری طرح گڈمڈ تھے۔ کھوجی نے بہت غور سے کھُرے دیکھے اور کہا۔ ”عورت آگے نہیں جا رہی۔ اُس کے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے۔ زبردستی گھسیٹا جا رہا ہے۔ وہ واپس جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ آدمی اسے روک رہے ہیں۔ وہ بیٹھ گئی ہے۔ یہ نشان غور سے دیکھیں۔ یہ ہاتھ کا نشان ہے۔ یہاں سے جب اسے اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس کا دوپٹہ جھاڑی کے کانٹوں نے پکڑ لیا ہے۔“

کھوجی اُٹھ کر آگے گیا۔ زمین پر جھک جھک کر چلتے بیس پچیس قدم دُور چلا گیا اور واپس آ گیا۔ پھر مجھے ساتھ لے جا کر کھُرے دکھانے لگا۔ ”اب آپ کو عورت کا کھُرا نظر نہیں آئے گا کیونکہ ان میں سے ایک آدمی نے اسے اٹھا لیا ہے۔“ اُس نے کھُروں کو غور سے دیکھ کر ایک کھُرے پر چھڑی رکھی اور کہا۔ ”اس آدمی کے اوپر وزن ہے۔“ آگے جا کر ایک جگہ کھُرے پوری طرح واضح ہو گئے۔ زمین بھُربھُری تھی۔ میں نے فوراً ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا۔ عملہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ان کھُروں کا مولڈ فوراً تیار کراؤ۔ اُس نے ایک کانسٹیبل کو وہاں پہرے پر کھڑا کر دیا اور خود مولڈ کا انتظام کرنے چلا گیا۔

”یہ دونوں دیہاتی ہیں۔“ کھوجی نے کہا۔ ”دیہاتی جوتیاں پہنے ہوئے ہیں۔ عورت کے متعلق مجھے شک ہے۔“

## دوپٹہ اور سینڈل

کھوجی کی یہ رائے میرے لیے حیران کُن تھی کیونکہ دیہاتنوں کی کسی شہری دکاندار سے

کیا دشمنی ہو سکتی تھی یہ واردات رہزنی کی بھی نہیں تھی کیونکہ مقتول کی جیب سے ایک سو چھتیس روپے برآمد ہوئے تھے۔ گھڑی اور سونے کی ایک انگوٹھی اُس کے جسم کے ساتھ تھی۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں آگے بڑھتا گیا۔ کچھ دُور بے شمار گرد اُڑتی نظر آئی۔ کھروں کا معاملہ چوپٹ ہوتا دکھائی دیا۔ مویشیوں کا بہت بڑا ریوڑ پھیلا ہوا آ رہا تھا۔ یہ مویشیوں کی خرید و فروخت کرنے والے لوگ تھے۔ وہ سو ڈیڑھ سو بھینسیں، گائیں اور بیل ساتھ لیے نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ ایسا ہی ایک ریوڑ چلا آ رہا تھا۔ رُخ ہماری طرف تھا۔ روکنا ممکن نہیں تھا۔ کم و بیش ایک سو مویشی ہمارے قریب آ گئے اور دُور دُور تک پھیلے ہوئے گزر گئے۔

ہم ان کے درمیان کھڑے رہے۔ بہت گرد اُڑ رہی تھی۔ ریوڑ گزر گیا تو چھ سات آدمی اس کے پیچھے نظر آئے۔ مجھے وردی میں دیکھ کر گھبرا گئے۔ ان میں ایک نے ایک سینڈل اٹھا رکھی تھی جو اُس نے پچھلے سٹریپ سے پکڑ کر ایک بھینس کو ماری۔ کھوجی نے اسے بلایا اور یہ سینڈل اس کے ہاتھ سے لے کر تلوا دیکھا۔ مَیں نے بھی دیکھا کہ یہ شہری قسم کی سینڈل تھی جو اس قسم کے آدمی کے پاس نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ ایک ہی پاؤں تھا۔ اُس نے ہمارے پوچھے بغیر کہا۔ "حضور، یہ پاؤں وہاں پڑا تھا"۔۔۔ اُس نے پیچھے کو اشارہ کیا۔ مَیں اسے اُسی جگہ تک ساتھ لے گیا۔ وہ جگہ کوئی تین فرلانگ دُور تھی۔ اُس نے بتایا کہ یہ پاؤں یہاں پڑا تھا۔ اُس نے اُٹھا لیا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ان لوگوں پر مجھے غصّہ بہت آیا کیونکہ انہوں نے کھُرے تباہ کر دیئے تھے۔ البتہ قاتل یا مغویہ کی ایک نشانی مجھے دے گئے۔ میں نے سینڈل کا یہ پاؤں اپنے پاس رکھ لیا۔

مَیں وہیں رُک گیا۔ آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مَیں سوچنے لگا۔ ایک صورت

یہ دماغ میں آئی کہ یہ عورت اغوا کی جارہی تھی۔ مقتول نے اسے ان آدمیوں سے چھڑانے کی کوشش کی اور مارا گیا لیکن عورت کمرے میں تھی۔ تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ یہ دو آدمی اس عورت کے ساتھ غیر آباد کوٹھی میں زبردستی کر رہے تھے۔ عورت کے شور پر مقتول اندر گیا اور مارا گیا۔ مگر عورت کے دوپٹے پر خون آلود ہاتھ کا نشان کیوں؟ سوچ سوچ کر میں نے کھوجی سے کہا کہ چلو تھانے چلیں۔ میرا یہ فیصلہ غلط تھا۔ مجھے اس علاقے کو اور زیادہ کھوجنا چاہیئے تھا مگر مویشیوں کے ریوڑ نے میرا دماغ خراب کر دیا۔

یہ انسانی فطرت کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو غلط فیصلے کرا دیتی ہیں۔ پولیس انسپکٹر کو مداریوں جیسے کرتب دکھانے پڑتے ہیں لیکن وہ عام ذہن کا انسان ہوتا ہے۔ ذرا سی بھول چوک یا غلط خیال اس کی تفتیش کا بیڑا غرق کر دیتا ہے۔ میں تھکنے یا ہارنے والا آدمی نہیں تھا مگر مویشیوں کے ریوڑ نے میرا موڈ ایسا تباہ کیا کہ میں واپس چلا گیا۔ مجھے صرف سینڈل کا ایک پاؤں ملا جسے دیکھ کر کھوجی نے تصدیق کی کہ جو کھُرے ہم نے کوٹھی سے یہاں تک دیکھے ہیں وہ اسی سینڈل کے ہیں۔

میں تھانے میں پہنچا تو شام کے سوا چار بج رہے تھے۔ میرے اے۔ ایس۔ آئی رگوناتھ نے مقتول کے گھر کا اتا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اس کے لواحقین کو ہسپتال لے جا کر لاش کی شناخت کرالی تھی۔ میں نے مخبروں کو ہدایات دے دیں جن میں سب سے زیادہ ضروری یہ تھی کہ مقتول کے متعلق جس قدر معلومات فراہم ہو سکیں کریں یعنی اس کا چال چلن، اس کی دوستیاں اور اس کی دشمنیاں اور اس کے گھریلو حالات۔ چال چلن معلوم کرنا تو بہت ضروری تھا کیونکہ واردات میں ایک عورت بھی تھی۔ میرے قیاس کے مطابق مقتول، عورت کی وجہ سے یا عورت کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کی۔ وہ روتی تھی۔ سوالوں کا جواب اس انداز سے دیتی تھی جیسے اسے اس تفتیش کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو۔ میں نے پوچھا کہ مقتول کا سلوک اس کے ساتھ کیسا تھا۔ اس نے جواب دیا "جیسا تھا، ٹھیک ہی تھا۔ اللہ اس کی قبر ٹھنڈی کرے۔"

میں نے پوچھا کہ اس کے علم میں ہے کہ اس کا کسی عورت کے ساتھ دوستانہ تھا؟ اس نے جواب دیا "اللہ بہتر جانتا ہے۔"

اُس کے اس انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ خاوند کو پسند نہیں کرتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ خاوند کے ساتھ اُس کا کبھی جھگڑا ہُوا ہے؟ اُس نے کہا "کبھی نہیں۔"

یہ اچھی شکل وصورت کی عورت تھی۔ اس کے تین بچے تھے۔ بڑا لڑکا عمر پندرہ سال۔ ایک لڑکی عمر دس سال اور ایک لڑکا عمر دو سال۔ مجھے اس عورت پر شک ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔ میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا۔ اسے پتہ نہ چلنے دیا اور اُس کے بیٹے کو میں تھانے لے گیا۔ اس کے ساتھ میں نے دوستانہ باتیں کیں اور اس کے باپ کے قتل پر افسوس کا اظہار کیا تو اس پر پولیس کا جو خوف طاری تھا وہ ختم ہو گیا۔ وہ آخر بچہ تھا۔ میری پیار بھری باتوں کے چکر میں آ گیا۔

اُس نے بتایا کہ اُس کا باپ اس کی ماں کے ساتھ بُرا سلوک کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ سے اکثر لڑتی تھی۔ تین چار بار ماں روٹھ کر میکے چلی گئی تھی۔ اُس کا باپ اس کی ماں کو کبھی کبھی مارتا پیٹتا بھی تھا۔ لڑکے کے دو ماموں دو تین بار آ کر اس کے باپ سے لڑے بھی تھے۔ میں نے پوچھا کہ وہ تمہارے باپ سے لڑے کس طرح تھے؟ یعنی ہاتھاپائی ہوئی تھی یا زبانی لڑائی؟ لڑکے نے بتایا کہ لڑائی گالی گلوچ تک ہوتی تھی۔ ایک بار چھوٹے

ماموں نے ابا کو کہا تھا کہ اب ہماری بہن کو تم نے پریشان کیا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

## مقتول عورتوں کا شکاری تھا

ان دونوں آدمیوں کو تھانے بلایا۔ پہلے بڑے بھائی کو اندر بلایا۔ اس سے میں نے پہلا سوال یہ پوچھا۔ ”مقتول تمہارا بہنوئی تھا۔ اس کے ساتھ تمہارا کیا جھگڑا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں جناب!“ اُس نے جواب دیا۔ ”کوئی جھگڑا نہیں تھا۔“

وہ گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اور کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اُسے باہر بھیج کر چھوٹے کو اندر بلایا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر چھوٹے بھائی نے بھی کہا کہ بہنوئی (مقتول) کے ساتھ اُن کا کوئی جھگڑا نہیں تھا تو میں دونوں کو تھانے میں پابند کر لوں گا۔ مگر چھوٹے بھائی کا رویہ مختلف تھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔ خون میں جوش تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ——”مقتول کے ساتھ تمہارا کیا جھگڑا تھا؟“

اُس نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا —— ”وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ مارا گیا ہے۔ اگر وہ قتل نہ ہوتا تو میں خود اسے قتل کر دیتا۔ اس کی زنانہ سامان کی دکان ہے۔ طرح طرح کی عورتیں اس کے پاس جاتی تھیں۔ یہیں سے وہ عورتوں کا شکاری بنا تھا۔ ہماری بہن کو گھر سے نکالنا چاہتا تھا۔“

”تمہارا بڑا بھائی کیوں کہتا ہے کہ مقتول کے ساتھ تمہارا کوئی جھگڑا نہیں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سیدھا سادا شریف آدمی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”پولیس سے ڈرتا ہے۔ مجھے بھی

کہتا تھا کہ تھانے میں یہ نہ بتانا کہ ہمارا مقتول کے ساتھ کوئی جھگڑا تھا ورنہ قتل میں پکڑے جائیں گے۔ میں نہیں مانا۔ میں نے کہا کہ پولیس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مرنے والا کس قماش کا آدمی تھا۔ اُس نے ضرور کسی کی بہو بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہوگا اور مارا گیا۔"

"کوئی ایک عورت بتا سکتے ہو جس کے ساتھ اُس کے تعلقات تھے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے بہت سوچا پھر کہنے لگا۔" اُس کا زیادہ دوستانہ ہندوؤں کی عورتوں کیساتھ تھا۔ ایک بار دو سکھوں نے اسے دکان میں پیٹ بھی ڈالا تھا۔ وہ دیہاتی تھے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ عورت اس کی دکان میں گئی اور دونوں سکھ باہر کھڑے رہے۔ مقتول نے نہ جانے اس عورت سے کیا کہا کہ عورت نے اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ سکھوں نے اندر جا کر اسے خوب پیٹا۔"

"کب کا واقعہ ہے؟"

"دو مہینے گذر گئے ہیں۔"

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ مقتول کی دکان کے ساتھ والے دکانداروں سے معلوم کرے کہ جن سکھوں نے مقتول کو پیٹا تھا انہیں کوئی جانتا پہچانتا ہے؟ اور کیا ان کی نشاندہی ممکن ہے؟ میرے دماغ میں تفتیش کی یہ لائن آگئی تھی کہ مقتول عورتوں کا شکاری تھا۔ اس کی تصدیق میرے دو مخبروں نے شام سے پہلے پہلے کر دی تھی۔ انہوں نے بھی شکاری کا لفظ ہی استعمال کیا تھا۔ دو تین دکانداروں نے انہیں بتایا تھا کہ عورت زیبائش اور نمائش کے سامان کی اتنی شیدائی ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی عورت قیمتی اور دلکش چوڑیاں مفت حاصل کرنے کے لیے اپنی عزت تک قربان کر دیتی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح کوئی کوئی عورت ایسی نکل آتی ہے اسی طرح کوئی کوئی دکاندار بھی ایسا نکل آتا ہے

جو عورتوں کے اس شوق سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے ۔ ہر عورت اور ہر دکاندار تو ایسا نہیں ہوتا ۔ مقتول بدی کے راستے پر چل پڑا تھا ۔

اے ۔ ایس ۔ آئی رگوناتھ دکانداروں سے یہ رپورٹ لایا کہ ڈیڑھ مہینے سے کچھ دن اُوپر گزرے کہ مقتول کو دو دیہاتی سکھوں نے پیٹا تھا ۔ دکانداروں نے یہ بھی بتایا کہ سکھ عورت نے اُسے گالیاں نہیں دی تھیں ۔ معاملہ گڑبڑ تھا ۔ عورت دکان میں تھی اور سکھ باہر تھے ۔ معلوم نہیں وہ سکھوں کی کیا لگتی تھی ۔ سکھ اندر چلے گئے اور مقتول کی اتنی پٹائی کی کہ اگر دکاندار چھڑا نہ لیتے تو وہ اسے جان سے ہی مار دیتے ۔ اس کے بعد سکھ اپنی عورت کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹ کر لے گئے ۔

ایک دکاندار نے رگوناتھ کو یہ بھی بتایا کہ کوئی ایک ہفتہ گزرا اُس نے ایک بار پھر اس عورت کو مقتول کی دکان کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا ۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ دکان کے اندر گئی تھی یا نہیں ۔ عورت جوان اور خوبصورت تھی ۔ اس دکاندار نے کہا کہ یہ عورت سامنے آئے تو وہ اسے پہچان سکتا ہے اور دونوں سکھوں کی شکلیں بھی اُسے یاد ہیں ۔

اس رپورٹ سے میرے ذہن میں اس لائن کا آنا قدرتی تھا کہ مقتول اِس سکھنی کی خاطر مرا ہے ۔ میں دیہاتی سکھوں کی عورتوں سے واقف تھا ۔ صحیح معنوں میں شیر اور دلیر ہوتی ہیں ۔ دوستی میں شیر اور دشمنی میں دلیر ، دوستی یا دشمنی عورت سے ہو یا مرد سے ۔ اس عورت کا مقتول کے ساتھ دوستانہ تھا ۔ وہ اس کی دکان میں آتی تھی ۔ یہ سکھ اُس کے بھائی بھی ہو سکتے تھے اور خاوند اور دیور بھی ۔ انہوں نے ایک روز اشارہ پا کر مقتول کو دکان میں پیٹا اور اپنی عورت کو گھسیٹ کر لے گئے ۔ اس سکھنی نے دوستی نبھاہی اور مقتول سے ملتی رہی ۔ آخر غیر آباد نئی کوٹھی میں اس کے ساتھ موقعہ پر پکڑی گئی ۔ یہی دو سکھ اُس کے تعاقب میں

آئے ہوں گے۔ انہوں نے اُس کے آشنا کو قتل کیا اور اپنی سکھنی کو ساتھ لے گئے۔ راستے میں وہ گھر جانے سے منکر ہو گئی۔ سکھوں نے اسے مارا پیٹا، گھسیٹا، اس کی ایک چوڑی وہاں بھی ٹوٹی اور دوپٹہ جھاڑی کے ساتھ اٹکا رہ گیا اور وہ عورت کو اُٹھا کر لے گئے۔

عین ممکن تھا کہ واردات بالکل ایسے ہی ہوئی ہو جیسے مَیں نے سوچی تھی مگر اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ ان سکھوں اور سکھنی کو کہاں ڈھونڈوں اور جُرم کس طرح ثابت کروں۔ مجھے اپنی اس غلطی کا بھی احساس ہُوا کہ مَیں نے کھُرا آدھے راستے میں مویشیوں کے ریوڑ کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے آگے جانا چاہیئے تھا۔ شاید میں ملزموں کے گھر تک نہیں تو اُن کے گاؤں تک پہنچ جاتا۔ مَیں نے سوچا کہ زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اب بھی تعاقب کیا جا سکتا ہے لیکن مجھے یہ خیال بھی آ گیا کہ میرا جانا ٹھیک نہیں۔ دیہات میں تھانیدار کا جانا بہت بڑا واقعہ ہوتا تھا۔ آجکل کے تھانیداروں نے تو رشوت کے لالچ میں اپنی قدر و قیمت اور وہ رعب ہی نہیں رہنے دیا جو ہمارے وقتوں میں تھا۔ رشوت اُس وقت بھی چلتی تھی۔ فرق یہ تھا کہ کوئی تھانیدار منہ کھول کر رشوت مانگتا نہیں تھا۔ دینے والے تھانیدار کے پاؤں میں رقم رکھ جاتے تھے۔ تھانیدار اس انداز سے رشوت قبول کرتے تھے جیسے انہوں نے دینے والے پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔

مَیں نے یہ سوچ کر دیہاتی علاقے میں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا کہ ملزم چوکنے ہو جائیں گے اور اپنے بچاؤ کی صورت پیدا کر لیں گے۔ مَیں نے یہ کام دیہاتی مخبروں، نمبرداروں اور چوکیداروں کے سپرد کرنے کا انتظام کر دیا۔ مَیں نے پولیس کے باقاعدہ اور ماہر مخبروں کو مندرجہ ذیل ہدایات دیں۔

ایسی سکھنی کی نشاندہی کریں جو جوان ہے، خوبصورت ہے۔ قمیض یا شلوار یا دونوں

فیروزی رنگ کے ہیں اور دوپٹہ کسی اور رنگ کا۔ فیروزی رنگ کا دوپٹہ میرے قبضے میں تھا۔ چوڑیاں پیازی رنگ کی۔ میں نے انہیں چوڑیوں کے ٹکڑے دکھائے۔

انہیں سینڈل کا ایک پاؤں دکھا کر کہا کہ اس کا دوسرا پاؤں ڈھونڈیں۔ ہو سکتا ہے کسی گاؤں سے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک دیا گیا ہو۔

کسی گھر میں کسی سکھنی کو بھائیوں نے یا خاوند نے مارا پیٹا ہوگا۔

کسی گاؤں میں کوئی سکھنی قتل ہوئی ہوگی اور قتل قدرتی موت کہہ کر چھپا لیا گیا ہوگا۔

میں نے ایسی ہی کچھ اور ہدایات دیں مگر میں نے کسی معجزے کی توقع نہ رکھی۔ بےشک پولیس کے مخبر اپنے کام میں ماہر تھے پھر بھی مجھے احساس تھا کہ میں نے انہیں جو کام سونپا ہے وہ تین دنوں میں میری مرضی کے مطابق نہیں ہو سکے گا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قاتل یہی دو سکھ ہیں اور کوٹھی میں مقتول کے ساتھ یہی سکھنی تھی۔ پوسٹمارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ چھری کا ایک زخم جگر میں چلا گیا ہے۔ دوسرا سینے میں جس سے پھیپھڑا کٹ گیا اور تیسرا ناف سے دو انچ دائیں اور تین انچ نیچے۔ اس سے انتڑیاں کٹی ہیں اور ایک کٹ ہتھیلی پر ہے۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق موت رات کے نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔

## لڑکی کنواری تھی

اگلے روز میں شہر میں پھیلائے ہوئے مخبروں کی رپورٹیں سن کر ان کے مطابق تفتیش کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ میں نے مقتول کی بیوہ اور اس کے بھائیوں کو بھی نظرانداز

نہیں کیا تھا لیکن انہیں یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ مجھے ان پر شک ہے۔ یہ میرا طریقہ تفتیش تھا کہ ابتدا میں مشتبہ افراد سے واردات کے متعلق اس طرح دوستانہ باتیں کیا کرتا تھا جیسے مَیں جاہل اور احمق ہوں اور اُن سے مشورہ لے رہا ہوں۔ بعض اوقات تو جس کے متعلق یقین ہوتا تھا کہ یہی مجرم ہے، مَیں اسے بھی یہی تاثر دے دیا کرتا تھا کہ مجھے اس پر ذرہ بھر شک نہیں۔ مَیں فوراً ہی اسے حراست میں لے کر اپنا استغاثہ کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مَیں صرف اُس وقت اُس کی گردن پہ ہاتھ رکھتا تھا جب مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کی گردن میرے ہاتھ سے نکل نہیں سکے گی۔

مَیں نے مقتول کی بیوہ اور اس کے بھائیوں کو ایسا ہی تاثر دے کر کھلی چھٹی دے دی تھی اور مُخبر ان کے پیچھے لگا دیئے تھے۔ بعید از قیاس نہیں تھا کہ بیوہ کے دونوں بھائیوں نے یا چھوٹے نے اپنے کسی دوست سے مل کر مقتول سے اس طرح انتقام لیا ہو کہ کسی عورت کی معرفت اسے کوٹھی تک لائے اور اسے قتل کر کے عورت کو ساتھ لے گئے۔

میں انہی بھول بھلیوں میں گم تھا کہ ایک معزز مسلمان میرے کمرے میں داخل ہُوا۔ وہ عمر، لباس، شکل وصورت اور ڈیل ڈول سے معزز لگتا تھا۔ مَیں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا۔ "بات کرتے شرم آتی ہے۔ اگر آپ مسلمان نہ ہوتے تو تھانے میں کبھی نہ آتا .... میری جوان بیٹی لاپتہ ہے۔"

اتنی سی بات سُنتے ہی میرا دھیان اُس عورت کی طرف گیا جو مقتول کے ساتھ غیر آباد کوٹھی میں گئی تھی لیکن میں نے جب اس شخص سے بے شمار سوال پوچھے تو مجھے مسلمان کی حیثیت سے خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں مگر پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے مجھے مایوسی ہوئی۔ اس باپ نے میرے سوالوں کا

جواب دیتے ہوئے بتایا کہ لڑکی کے چال چلن پر اسے کوئی شبہ نہیں۔ وہ کنواری ہے۔ کسی کے ساتھ اُس کی راہ و رسم نہیں۔ گھر میں پردے کی پابندی ہے۔ گھر میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ وہ ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہو۔ اسے لاپتہ ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔ شام کے بعد کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکلی تھی۔

باپ نے کہا۔ "اگر مجھے یا لڑکی کی ماں کو ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ لڑکی نے کسی کے ساتھ کوئی اچھا یا بُرا تعلق قائم کر رکھا ہے تو میں تھانے میں کبھی رپورٹ نہ کرتا۔ یہی سمجھتا کہ کمبخت مر گئی ہے۔"

لڑکی کی طبیعت اور عادات کے متعلق باپ نے بتایا کہ طبیعت شگفتہ ہے مگر غصے میں آجائے تو پاگل ہو جاتی ہے اور گھر والوں کو بھی پاگل کر دیتی ہے۔ اس کا غصہ بلا وجہ نہیں ہوتا۔ گھر میں پوری دلچسپی لیتی ہے۔ ماں باپ کا احترام کرتی ہے مگر غلطی ماں کرے یا باپ، وہ کسی کو بخشتی نہیں۔ میرے کچھ اور سوالوں کا جواب دیتے ہوئے باپ نے بتایا کہ لڑکی کو بناؤ سنگھار کی عادت نہیں۔ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں۔

یہ تو باپ کی رائے تھی۔ پولیس کی رائے والدین کی رائے سے بہت مختلف ہوا کرتی ہے۔ میرے ذہن پر قتل کی واردات سوار تھی۔ میں نے رپورٹ درج کر کے اپنے اے ایس آئی رگھو ناتھ کو بلایا اور یہ کیس اس کے حوالے کر دیا۔ میں نے لڑکی کے باپ کو باہر بھیج کر رگھو ناتھ سے کہا۔ "تم اناڑی نہیں ہو رگھو ناتھ! میں تم سے صرف یہ سوال پوچھوں گا کہ مجھے اچھی طرح جانتے ہو نا؟"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن مجھے دیکھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ بڑے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "ہاں ملک صاحب! میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کوئی

فکر نہ کریں"۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں ۔ میں مسلمان پروری کی وجہ سے غیر مسلموں میں بدنام تھا۔ جب کوئی مسلمان، پولیس کی لپیٹ میں آجاتا تھا تو مجھے بہت دُکھ ہوتا تھا۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس کی عزت کا تحفظ کروں ۔ مسلمانوں کے آپس کے لڑائی جھگڑے کی میں رپورٹ رجسٹر نہیں کیا کرتا تھا۔ ان کا راضی نامہ کرا کے رات چوری چھپے اُن کے گھروں میں جا کر انہیں لعن طعن کیا کرتا تھا۔ اب یہ کیس ایک مسلمان گھرانے کا آگیا جو بہت ہی نازک تھا تو میں نے ضروری سمجھا کہ رگھوناتھ کو خبردار کردوں کہ اس کیس میں وہ کوئی ہیرا پھیری نہ کرے اور رشوت کا خیال دل سے نکال دے اور لڑکی برآمد کرنے دم لے۔

اس وارننگ کے بعد میں نے اسے دیگر ہدایات دیں اور بتایا کہ یہ ضروری نہیں کہ باپ کی رائے کے مطابق لڑکی کے کسی آدمی کے ساتھ مراسم نہ ہوں۔ اکثر ملوں ہوتا ہے کہ والدین جسے اغوا کہتے ہیں وہ اغوا نہیں ہوتا، لڑکی اپنی مرضی سے جاتی ہے۔ اسے کوئی سوتے وقت اٹھا کر نہیں لے گیا۔ یہ شہر ہے جنگل نہیں کہ اِدھر اُدھر ہوئی اور غائب ہوگئی۔ باپ نے کہا تھا کہ گھر میں پردے کی پابندی ہے لیکن میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کا برقعہ گھر میں رکھا ہے۔ مجھے کچھ شک پیدا ہوا۔ میں نے رگھوناتھ سے کہا ۔" یہ علاقہ بیگی کا معلوم ہوتا ہے۔ بیگی کو پکڑو۔ وہ تمہاری مدد کرے گی"۔

آپ کی دلچسپی کی خاطر آپ کو بیگی کے متعلق تفصیل سے بتادوں کہ یہ کیا چیز تھی۔ بیگی ایک اُدھیڑ عمر عورت تھی جو آسمان سے تارے توڑ لاتی تھی۔ میں نے پہلے بھی کسی کہانی میں ایسی ایک عورت کا ذکر کیا ہے۔ میں کہانی تو پرانی سُنا رہا ہوں لیکن بیگی جیسی عورتیں آج بھی ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں کمال یہ ہوتا ہے کہ ہوتی بدنام ہیں لیکن شریف

گھرانوں میں بھی مقبولیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ شریفوں کے ساتھ ایسی شریفانہ باتیں کرتی ہیں کہ زاہد اور پارسا لگتی ہیں اور بدمعاشوں سے ہمکلام ہوں تو انہیں انگلیوں پر نچا دیتی ہیں۔ انسان کی کمزوریوں، دُکھتی رگوں، خواہشوں اور آرزوؤں کو نفسیات کے ڈاکٹروں کی طرح سمجھتی ہیں۔ ان عورتوں کا کام ہوتا ہے رشتے ناطے کرانا، آشنائی کرانا، پیغام رسانی کرنا، بچھڑے ہوئے دلوں کو ملانا، جہاں وہ ملیں وہاں پہرہ دینا اور منہ مانگی اُجرت لینا۔ کسی باعزت گھرانے کی لڑکی کا رشتہ باعزت گھرانے میں کرانا ان کا کمال ہوتا ہے۔ روتوں کو ہنسا دینا، ہنستوں کو رُلا دینا، خود ہنستے ہنستے اس طرح رو پڑنا کہ آنسو تھمنے میں نہ آئیں ان عورتوں کا خصوصی وصف ہوتا ہے۔ ہونٹوں پر جیسی مسکراہٹ چاہیں لا سکتی ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں وہ ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسا تاثر پیدا کر سکتی ہیں کہ بیس بائیس سال کا نوجوان اپنی ہم عمر لڑکی کو چھوڑ کر اُن کے قدموں میں جا گرے۔ ایسی عورتیں گھر گھر کی خبر رکھتی ہیں۔ شہر کی زیادہ سے زیادہ عورتوں کو جانتی ہیں اور ہر ایک لڑکی اور عورت کے اندر باہر کے حالات بتا سکتی ہیں۔

یہ کام ان کے فطری تقاضوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اس سے انہیں نفسیاتی خلفشار سے ذرا نجات مل جاتی ہے اور انہی اوصاف سے وہ پیسہ کماتی ہیں۔ ایسی عورتیں دیہات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں بھی انہیں کوئی باقاعدہ ٹریننگ نہیں دی جاتی۔ ایک خاص قسم کا پس منظر اور خاص قسم کے حالات ہوتے ہیں جو اس قسم کی عورتوں کو جنم دیتے ہیں۔

بیگی ایسی ہی عورت تھی۔ میں نے جب اس تھانے کا چارج لیا تو مجرموں کی فوج کے ساتھ بیگی کا بھی مجھے چارج دیا گیا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر اڑتیس سال تھی اور پولیس کے

لیے مخبری کرتے اسے ساڑھے تین سال ہو گئے تھے۔ خوبرو عورت تھی۔ اس عمر میں بھی اس میں ایسی کشش تھی اور طبیعت میں ایسی شگفتگی کہ بدمعاشوں اور پارساؤں کو برابر متاثر کرلیتی تھی۔ ان عورتوں کا گھناؤنا کردار یہ ہوتا ہے کہ شریف گھرانے کی لڑکیوں کو بھی ورغلا کر ان کی آشنائی کسی سے کرا دیتی ہیں۔ بیگی کی اپنی جوانی کچھ ایسی ہی گزری تھی کہ اسے اپنی تسکین کا سامان کرنا پڑا۔ اس کی شادی ایسے لڑکے سے کر دی گئی تھی جو دماغی لحاظ سے مفلوج تھا۔ امیروں کا لڑکا تھا۔ بیگی کو انہوں نے منہ مانگے دام دے کر اپنے پاگل لڑکے کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ بیگی زندہ دل لڑکی تھی۔ اس نے دل کو مردہ نہ ہونے دیا اور نت نئی دوستیوں کی عادی ہو گئی۔ شادی کے آٹھویں سال اس کا پگلا دولہا رات منڈیر سے صحن میں گرا اور مر گیا۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اسے بیگی نے گرایا تھا۔ واللہ اعلم۔ اس وقت اس کا نام بیگی نہیں فرزانہ تھا۔ شادی کے بعد فرزانہ بیگ کہلانے لگی اور پھر لوگ اسے بیگی کہنے لگے۔

میں نے جب اسے دیکھا تو وہ اپنا نام شاید بھول گئی تھی۔ اس نے نام بیگی بتایا تھا۔ وہ میرے تھانے کے علاقے کی ایک مجرم تھی جو مجھے اس لیے اچھی نہ لگی کہ مجرم تھی اور یہ افسوس بھی ہوا کہ وہ مسلمان تھی لیکن پولیس کو دو چار ایسے مجرم پالنے پڑتے ہیں جو مجرموں کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ میرے لیے بیگی کا مجرم وجود لازمی تھا۔ اس نے میری بہت مدد کی۔ اب اس شریف آدمی کی بیٹی لاپتہ ہو گئی تو میں نے رگھوناتھ سے کہا کہ وہ بیگی سے پوچھے کہ اس لڑکی کا کسی کے ساتھ یارانہ تھا یا نہیں اور یہ لڑکی کیسی ہے۔ پوری ہدایات کے ساتھ یہ کیس رگھوناتھ کو سونپ کر میں قتل کے کیس میں اُلجھ گیا۔

مقتول کی بیوہ سے پوچھ گچھ کی اور اس سے پوچھا کہ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ اُس کا خاوند کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "وہ میرے بچوں کا باپ تھا۔ میں

اُس کا مُردہ خوار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے۔"

اس عورت کے دونوں بھائیوں کو بُلایا۔ انہیں بہت چکر دیئے اور میں ان کے انداز سے اور باتوں سے یہ اندازہ کرتا رہا کہ اُن میں ایسا سنگین جرم کرنے کی ہمت ہے؟ مجھے ان میں ایسی ہمت نظر نہیں آئی۔

## خاوند اسے بدچلن کہتا تھا

دو دن گزر گئے۔ دیہات سے کوئی کام کی خبر نہیں آ رہی تھی۔ کام کی صرف اتنی سی خبر ملی کہ دو قوعہ کی رات ایک گاؤں کے ایک آدمی نے دو آدمیوں کو گاؤں کے قریب سے گزرتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت تھی۔ اس آدمی نے میرے مخبر کو بتایا کہ اسے ایسی آواز سُنائی دی تھی جیسے عورت رو رہی تھی۔ اس نے اس خیال سے دھیان نہ دیا کہ یہ لوگ کسی ماتم پر جا رہے ہوں گے۔ اندھیرے میں اسے سائے سے نظر آئے تھے جن میں صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کے ساتھ ایک عورت ہے۔

رات کے غالباً نو بج رہے تھے۔ میں اور رگھوناتھ تھانے کے لان میں کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ بیگی آگئی۔ کہنے لگی۔ "اندر چلو۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا"۔۔۔۔ میں اسے اور رگھوناتھ کو اپنے ڈیرے میں لے گیا۔ بیگی لاپتہ لڑکی اور اس کے خاندان کے متعلق رپورٹ دینے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ جو لڑکی لاپتہ ہُوئی ہے وہ نیک اور شریف لڑکی ہے۔ خاندان بھی نیک ہے۔ بیگی اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتی تھی۔ اس کی نظر ہر لڑکی اور لڑکے پر رہتی تھی کیونکہ اسے رشتے ناطے کرنے کا کاروبار چلانا ہوتا تھا اور کوئی

فرمائش کرے تو دوستی بھی کرانی ہوتی تھی۔ بیگی نے بتایا کہ یہ لڑکی اپنی مرضی سے کسی کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ بیگی نے بتایا کہ اس لڑکی کی بڑی بہن شادی شدہ ہے مگر گھر بیٹھی ہے کیونکہ خاوند کو اس کے چال چلن پر شبہ ہے۔ بیگی نے کہا۔" میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ بدچلن نہیں۔"

" تم کس طرح جانتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

" میں پیغام لے کر جاتی تھی لیکن اس لڑکی نے مجھے دھتکار دیا تھا۔" بیگی نے جواب دیا اور ایک ایسا انکشاف کیا کہ میں چونک اٹھا۔ اس نے کہا۔" یہ جو آدمی قتل ہو گیا ہے وہ اس شادی شدہ لڑکی کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی اس کی دکان میں کچھ خریدنے کے لیے گئی تھی۔ دکاندار اس پر مر مٹا۔ اس نے یہ کام مجھے سونپا کہ اس کا اس کے ساتھ دوستانہ کرا دوں۔ میں دو بار اس آدمی کا پیغام لے کر اس لڑکی کے گھر گئی۔ دونوں بار اس کا خاوند آ گیا۔ میں تیسری بار گئی تو اس لڑکی نے مجھے گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ دراصل ایسی ویسی ہے ہی نہیں لیکن خاوند اسے اپنے گھر لے جاتا نہیں۔"

بیگی کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں لیکن میں سوچتا رہا کہ اس لڑکی کے خاوند نے ہی سالی کو گم نہ کرا دیا ہو۔ اس کے ساتھ مقتول کا تعلق بھی تھا اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس آدمی کے ساتھ گفت گو کی جائے۔ وہ تعلیم یافتہ شہری تھا۔ میں نے صبح کے وقت اسے تھانے بلایا۔ ہر شہری کی طرح جسے تھانے بلایا جاتا ہے وہ ڈرا ہوا تھا۔ میں نے تسلی دلاسہ دے کر اس کا حوصلہ تازہ کیا اور پوچھا۔ "اپنی بیوی کو بساتے کیوں نہیں؟"۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ غلاموں کی طرح بولا۔

"بسالوں گا جناب آج ہی اسے گھر لے جاؤں گا"

"تم اسے گھر لے جاؤ یا نہ لے جاؤ" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ اسے تم نے گھر سے کیوں نکال دیا ہے؟ کیونکہ اس کا چال چلن اچھا نہیں؟"

"ہاں حضور!" اُس نے جواب دیا۔ "یہی بات ہے"

"تمہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ اس کا چال چلن اچھا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے محلے میں ایک بدکار عورت رہتی ہے" اُس نے جواب دیا۔ "اس کا نام بیگی ہے۔ وہ مردوں عورتوں کے یارانے لگاتی رہتی ہے۔ میں نے اسے دو تین بار دیکھا کہ میری غیر حاضری میں میری بیوی کے ساتھ رازداری سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر میں نے اپنی بیوی پر نظر رکھی۔ ایک بار اسے اس دکاندار کے گھر جاتے دیکھا جو قتل ہو گیا ہے اور پھر ایک بار اسے اس کی دکان سے نکلتے دیکھا۔ یہ دکاندار مارا گیا ہے۔ اللہ اس کے گناہ معاف کرے۔ سخت بدکار آدمی تھا۔ شریف لوگ اس کے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ یہ عورت جس کا نام بیگی ہے اس کی دلالی کرتی رہی ہے۔ بیگی کو وہ خوب مال کھلاتا تھا......

"میں غیرت کے جوش میں ایک روز اس دکاندار کی دکان پر چلا گیا۔ میں یہ سوچ کر گیا تھا کہ شاید یہ کمبخت میری بیوی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں تیار ہو کر گیا تھا مگر اُس سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ تم اپنی بیوی کو سنبھالو۔ میں اتنا کمینہ نہیں ہوں کہ محلے کی بہو بیٹیوں کا بھی خیال نہ کروں۔ میں خود تمہارے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی آ گئے۔ تمہاری بیوی میری دکان میں آ جاتی ہے۔ میں نے اسی روز بیوی کو

گھر بھیج دیا۔"

میں نے اس پر کم و بیش دو گھنٹے جرح کی لیکن قتل کی واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نظر نہ آیا۔ اس سے اس کی سالی کے متعلق پوچھا تو اس نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا۔ "میں اسے شریف لڑکی سمجھتا رہا ہوں لیکن اپنی بیوی کو بھی میں شریف ہی سمجھتا تھا۔ یہ لڑکی (سالی) میرے پاس تین چار دفعہ آئی تھی اور مجھے کہا تھا کہ میں اس کی بہن پر جھوٹا الزام عائد کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ دکاندار (مقتول) نے مجھے یقین دلایا ہے کہ تمہاری بہن اس کے پاس جاتی رہی ہے۔ میری سالی نے مجھے بُرا بھلا بھی کہا تھا۔"

اس آدمی کی باتیں کچی کچی اور دوغلی تھیں۔ وہ بیک وقت بُزدل بھی تھا اور دلیر بھی۔ کبھی وہ یوں بات کرتا جیسے بے حد کمزور اور ڈرپوک آدمی ہے اور کبھی یوں شیر ہو جاتا جیسے میرے منہ پر گھونسہ دے مارے گا۔ اس قسم کے لوگ ہمیشہ انتہائی قدم اٹھایا کرتے ہیں۔ ان میں غصے کی لہر آجائے تو قتل یا خودکشی کر لیتے ہیں اور اگر دوسری لہر آجائے تو دشمن کے پاؤں میں سر رکھ دیتے ہیں۔ بیگی نے ایک اور ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ اس آدمی کو اپنی بیوی کے خلاف وہم ہو گیا ہے اور مقتول نے اس کی بیوی کو ذلیل کرنے کے لیے اس کے خاوند کو بھڑکا دیا ہے۔ بہر حال میں نے اس آدمی کو کہہ دیا کہ وہ ہر روز صبح کے وقت تھانے میں آجایا کرے۔ میں اسے قتل کی واردات یا اس کی سالی کی گمشدگی کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک وابستہ سمجھنے لگا تھا اور میں یہ بھی سمجھنے لگا تھا کہ مقتول اس کی بیوی کو اس کے خاوند کے دل میں غلط فہمی پیدا کر کے بلیک میل کرتا رہا تھا۔ میری اس رائے کی تصدیق بیگی نے بھی کی تھی۔

میں نے رگھوناتھ سے کہا کہ اس لڑکی کی گمشدگی کی تفتیش ہم دونوں مل کر ہی کریں تو بہتر ہے۔ ضروری نہیں تھا کہ اس واردات کا تعلق قتل سے ہو لیکن پولیس کو گُپ اندھیرے میں کالے رنگ کی بلّی ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ ایسے اندھیرے میں ہلکی سی آہٹ سنائی دے تو پولیس اسے بلّی کی آہٹ سمجھ لیتی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ پولیس کے لیے انتہائی معمولی چیزیں یا کسی معصوم سے بچّے کی کہی ہوئی توتلی سی بات بھی بہت بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ میں اس لڑکی کو جس کی چھوٹی بہن لاپتہ ہو گئی تھی اور جسے خاوند نے مقتول کے ساتھ وابستہ کر کے میکے بٹھا دیا تھا، ملنے کا فیصلہ کیا لیکن میں اسے تھانے نہیں بُلانا چاہتا تھا۔

اس کے گھر کا اتا پتا معلوم کر کے میں رات کو پرائیویٹ کپڑوں میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہاں جانے کا میرے پاس جواز تھا۔ اس گھر کی جوان اور کنواری لڑکی لاپتہ ہو گئی تھی۔ میں اس کے باپ سے ملا۔ وہ واقعی بے چارا شریف انسان تھا۔ دو دنوں میں اپنی بچّی کے غم میں اسّی برس کا بوڑھا ہو گیا تھا۔ میں اس کے دل کے روگ کو سمجھتا تھا۔ میں نے باتوں سے اس کا روگ کم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ کہہ رو پڑا کہ اس عمر تک صرف ایک کمائی کی تھی اور وہ تھی عزّت۔ بیٹھے بٹھائے وہ بھی گئی۔ بڑی لڑکی بدچلنی کے الزام میں گھر بیٹھی ہے اور چھوٹی لاپتہ ہے۔ آپ کو کیسے بتاؤں کہ اپنے آپ کو خودکشی سے کس طرح روک رہا ہوں۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی بڑی بیٹی بدچلن نہیں ہے اور میں اسے آباد کرنے کا بندوبست کر دوں گا۔ اس کے خاوند کو میں نے پابند کر رکھا ہے۔ آپ ذرا اپنی بڑی لڑکی کو میرے پاس الگ بٹھا دیں۔ مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ نتائج مجھ پر چھوڑیں۔ مجھے

اس وقت تھانیدار نہ سمجھیں۔ میں آیا تو اپنی ڈیوٹی پر ہوں لیکن مسلمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔ دیکھ لیں وردی اتار کر اندھیرے میں آیا ہوں۔

وہ اندر گیا اور بڑی بیٹی کو میرے پاس بھیج دیا۔ اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ ایک شریف باپ کی ایک بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ وہ بیٹیوں کا باپ ہے اور دوسری بدنصیبی یہ کہ اس کی بیٹیاں خوبصورت ہیں۔ یہ لڑکی خوبصورت تھی اور جو لاپتہ ہو گئی تھی وہ بھی یقیناً خوبصورت ہو گی۔ میں نے اس کی بڑی بہن کو بڑی ہی غور سے دیکھا۔ وہ اُداس تھی۔ مجھے اس کے چہرے مہرے میں بدچلنی نظر نہ آئی۔ ہم تو ایک نظر میں چہرے پڑھ لیا کرتے ہیں۔

میں نے اُس کے ساتھ ہمدردانہ باتیں کر کے اس کا ڈر دُور کر دیا اور اسے کہا۔ "مجھے تھانیدار نہیں اپنا بھائی سمجھ کر مجھے ہر ایک بات بتا دو کیونکہ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ اپنی بہن کے متعلق بھی مجھے سب کچھ بتا دو۔ تمہاری ازدواجی زندگی اور تمہاری بہن کی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے کہ تم مجھے کیا بتاتی ہو اور کیا چھپاتی ہو ...سب سے پہلے مجھے اپنے متعلق بتاؤ کہ وہ جو دکاندار قتل ہو گیا ہے وہ تمہاری بدنامی کا باعث کس طرح بنا؟"

## کیا وہ پاگل تھی؟

اس نے جو بیان دیا اس کے کچھ الفاظ آج بھی یاد ہیں۔ میں ذرا مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔ اُس نے کہا۔ "ایک بار میں کچھ چیزیں خریدنے اس آدمی (مقتول) کی دکان میں چلی گئی۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ وہ ہمارے محلے میں پچھلی گلی میں رہتا ہے۔ میں برقعے میں تھی۔ اس کی دُکان میں نقاب اٹھا دیا۔ وہ بڑے مزے مزے سے باتیں کرتا تھا

جیسے وہ مجھے جانتا پہچانتا ہو۔ اس نے کوئی بیہودہ بات نہیں کی۔ میں بھی اسے ایک بااخلاق دکاندار سمجھ کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ میں نے چوڑیوں کا ایک سیٹ، ایک انگیہ، دو گز ربن اور دو پراندیاں لیں۔ اُس نے بہت ہی کم قیمت لی جس سے میں حیران ہوئی۔ وہ باتوں باتوں میں مجھ سے میرے گھر کا پتہ، والد صاحب کا اور خاوند کا نام پوچھ چکا تھا۔ میں نے قیمت کے متعلق اسے کہا کہ آپ مال اتنا سستا بیچتے ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ صرف تمہارے لیے ہے کیونکہ تم میری پڑوسن ہو۔ میں تمہارے اباجان کا برخوردار ہوں.....

"اس طرح اُس نے میرے دل میں احترام سا پیدا کر دیا۔ دو تین روز بعد ہمارے محلے کی ایک بڑی ہی بدنام عورت میرے پاس آئی۔ اس کا نام بیگی ہے۔ میرے میکے گھر آیا کرتی تھی اور میری امّی کو میرے لیے رشتے بتایا کرتی تھی۔ اب میں اپنے خاوند کے گھر تھی۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ بیگی آئی تو میرے ساتھ پیار اور محبت کی باتیں کرنے لگی۔ اس بدبخت عورت میں یہ وصف ہے کہ اپنے دشمنوں کے دل بھی موہ لیتی ہے۔ اُس نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور بڑی استادی سے اس دکاندار کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کی تعریفیں کرنے لگی.....

"میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ اچانک میرا خاوند آگیا۔ بیگی کو دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ بیگی چلی گئی تو خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ انہوں نے ذرا غصے سے کہا کہ آئندہ یہ عورت یہاں نہ آئے۔ میرے خاوند میں یہ خامی ہے کہ وہمی ہے۔ دو روز بعد بیگی پھر آگئی۔ میں دعائیں کرنے لگی کہ یا خدا! وہ نہ آجائیں۔ مجھ میں اتنی سیانا پن نہیں تھی کہ اس چالاک اور ہوشیار عورت کو ٹال کر گھر سے نکال دیتی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

وہ آ گئے اور غصّے میں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اب کے بیگی نے بڑے اچھے لہجے میں میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ دکاندار مجھے چاہتا ہے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ اسے ٹالا۔ وہ چلی گئی تو خاوند نے صاف الفاظ میں میرے چال چلن کے خلاف شک کا اظہار کر دیا.....

ان کا وہم دُور کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میری قسمیں ان کا شک رفع نہ کر سکیں۔ اگلے روز وہ کٹنی، بدکار پھر آ گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے شرافت سے سمجھا دوں گی کہ یہاں نہ آیا کرے لیکن اُس نے اُس دوزخی دکاندار کا پیغام مجھے دے کہ میرا خاوند گھر مار دیا۔ میں نے اسے گالی گلوچ کر کے گھر سے نکال دیا۔ دو ہی دن گذرے ہوں گے کہ دروازے میں سے کسی نے ایک لفافہ اندر پھینکا۔ میں نہیں دیکھ سکی کہ وہ کون تھا۔ خاوند گھر نہیں تھا۔ لفافہ کھولا تو اسی دکاندار کا پیغام نکلا مگر الفاظ ایسے تھے کہ میں یہ رُقعہ خاوند کو نہیں دکھا سکتی تھی۔ مثلاً اس قسم کے الفاظ کہ میں انتظار کرتا رہا اور تم نہ آئیں۔ اگر یہ رقعہ خاوند دیکھ لیتا تو اسے یقین ہو جاتا کہ میں اس کے پاس جاتی رہتی ہوں۔ میں نے رقعہ پھاڑ کر جلا دیا اور سوچنے لگی کہ بدمعاش مرد شریف لڑکیوں کے پیچھے اس دیری سے بھی پڑ جایا کرتے ہیں؟ میں نے پردے میں زندگی گزاری تھی اور پردے میں ہی گزر رہی تھی....

"میں اس کے گھر چلی گئی اور اس کی بیوی کو بتایا کہ اپنے خاوند کو باز کر لے۔ مجھے توقع تھی کہ وہ تڑپ اُٹھے گی کہ اس کا خاوند ایسا ہے۔ لیکن اس نے کہا۔ وہ تو میرا نام کا خاوند ہے۔ مردود نے باہر نہ جانے کتنی بیویاں رکھی ہوئی ہیں۔ جب کبھی شکایت کرتی ہوں تو برتن توڑ دیتا ہے، گالیاں بکتا ہے اور ایک دو تھپڑ بھی جڑ دیتا ہے۔ میں تو

اس کافر کے بچے پال رہی ہوں"....

"میں اپنا سامنہ لے کر اس کے گھر سے نکلی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا ابھی خاوند میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اس دکاندار کی دکان پر چلی گئی۔ اس پر خوب برسی۔ منہ میں جو آیا بک ڈالا لیکن وہ ہنستا رہا اور محبت کا اظہار کرتا رہا۔ میں گھر آئی تو یہ اطمینان ہوا کہ خاوند نہیں آیا تھا۔ اس سے اگلی شام میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ خاوند گھر آیا تو اس نے یہ حکم سنایا کہ ابھی اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں تمہیں نہیں رکھ سکتا۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے کہا۔ "تم سمجھتی ہو کہ میں ورکشاپ میں چلا جاتا ہوں تو تم آزاد ہو جاتی ہو.... میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کل تم اس بدمعاش کے گھر گئیں۔ وہ تمہیں وہاں نہ ملا تو اس کی دکان پر گئیں۔ جب تم وہاں سے نکلیں تو میں اس بدکار سے ملا۔ میں اسے قتل کرنے کے لیے گیا تھا لیکن اس نے مجھے بتایا کہ وہ نہیں بلکہ تم اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اسے محلے داری کا خیال ہے اور تم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اگر تم سچی ہو تو اس کے گھر اور اس کی دکان پر کیوں گئی تھی"....

"میں اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ اس نے مجھے زبانی اور تحریری بیہودہ پیغام بھیجے ہیں ورنہ وہ پوچھتا کہ رقعہ کہاں ہے۔ بس ایسے چکر میں آئی جس سے نکلنا مجھے آتا ہی نہیں تھا۔ میں غم اور غصے سے جلتی بھنتی اپنے گھر آ گئی....

"امی اور ابا جان کو بتایا تو انہوں نے سر پیٹ لیے۔ میری چھوٹی بہن نے سنا تو اس پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ یہ اس کی ایک کمزوری ہے۔ برداشت تو کرتی ہی نہیں۔ اب بھی مجھے ڈر ہے کہ اسی پاگل پن میں گھر سے نکل گئی ہے اور دریا میں ڈوب مری ہے"

"کیا وہ واقعی پاگل ہے؟" میں نے پوچھا۔

# بڑی بہن ڈرپوک چھوٹی دلیر

"نہیں" اس نے جواب دیا "اچھی خاصی عقلمند اور سلیقہ شعار بیٹی ہے۔ اگر اُسے غصہ آجائے تو پاگلوں کی حرکتیں کرنے لگتی ہے..... پھر یوں ہوا کہ میری امی اور ابا جان میرے خاوند کے پاس گئے۔ اس وہمی آدمی نے دو چار اور باتیں گھڑ کے مجھے بدچلن قرار دے دیا۔ ہم دو ہی بہنیں ہیں۔ خدا نے بھائی دیا ہی نہیں۔ ہماری آپس میں سہیلیوں کی طرح رازداری اور بے تکلفی ہے۔ چھوٹی بہن نے مجھ سے پوچھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے اسے اصل واقعہ سنا دیا۔ وہ میرے خاوند کے پاس گئی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سُود۔ معلوم نہیں کس کی نظر لگی، ہماری اتنی پیاری اور باعزت زندگی تباہ ہو گئی۔ دن گزرنے لگے۔

ایک روز بیگی یہاں بھی آگئی۔ میری ماں کے پاس بیٹھ کر میرے متعلق افسوس کا اظہار کیا پھر میرے خاوند کے خلاف باتیں کیں۔ میرا بس چلتا تو میں اس کا گلا دبا دیتی۔ وہ میرے پاس آ بیٹھی اور بڑے پیار سے کہنے لگی کہ تمہاری یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے خاوند کا دماغ صحیح کر لوں گی۔ اس قسم کی باتوں سے اُس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا اور کہا "تمہارے پاؤں دراصل وہ نہیں جمنے دے رہا۔ وہ جو تم پر مرتا ہے۔ تم صرف ایک بار اس کے پاس چلی جاؤ۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ صرف ایک بار آجائے پھر وہ تمہارے خاوند کے دل سے سارے وہم نکال دے گا۔ میں نے بیگی کو گالی گلوچ کی مگر اس پر ذرہ بھر اثر نہ ہُوا۔ اُلٹا بولی "تم شادی شدہ ہو۔ تمہارا کیا بگڑ جائیگا۔ ورنہ ساری عمر گھر بیٹھی رہو گی اور لوگ تمہیں بدچلن سمجھتے رہیں گے!....

" اسے لعنت ملامت کر کے گھر سے نکالا۔ منہ چھپا کر رونے کے سوا میں کر بھی

کیا سکتی تھی ۔میں نے چھوٹی بہن کو بتا دیا کہ آج یہ بات ہوئی ہے ۔ وہ امّی اور ابا جان کو بتائے بغیر میرے خاوند سے ملی اور اسے بتایا اور اسے شرم بھی دلائی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک روز بہن مجھے بتائے بغیر کسی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے اس مردود دکاندار کے پاس چلی گئی ۔ واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بہت اکھڑی اکھڑی سی تھی میں نے پوچھا کہ اپنی سہیلی سے لڑ کر آئی ہو؟ تب اس نے بتایا کہ وہ اس دکاندار کی دکان پر گئی تھی اور اسے کہا کہ اس نے ایک جوان لڑکی کی زندگی تباہ کر دی ہے ۔ اس نے میری بہن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ میری بہن اس کے آگے روئی بھی ۔ اس کی منت بھی کی اور کہا کہ وہ میرے خاوند سے یہ کہ دے کہ یہ سب جھوٹ تھا مگر اس دوزخی نے پوری بے شرمی سے میری بہن کو کہا ” تمہاری بہن نے میری بات ایک بار بھی نہیں مانی ۔ اس کی جگہ تم تھوڑی سی دیر کے لیے آجاؤ ۔ میں تمہارے بہنوئی کو یقین دلا دوں گا کہ تمہاری بیوی پاک صاف عورت ہے “۔ ظاہر ہے کہ میری بہن ایسی بات برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔ اُس نے اسے دھتکار دیا تو وہ بولا ” اگر بہن کو خاوند کے گھر آباد کرنا چاہتی ہو تو میری بات مان جاؤ ۔ یہ ساری دکان تمہاری ہے ۔ جو کچھ پسند ہے اُٹھا لے جاؤ.....

” میں سمجھ گئی کہ یہ غنڈہ اتنا دلیر کیوں ہے اور میں یہ بھی جان گئی کہ میرا خاوند میرے والدین کی پرواہ کیوں نہیں کرتا ۔ صرف اس لیے کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں ، کوئی ماموں نہیں ، چچا نہیں ، تایا نہیں ۔ ایک ابا جان ہیں ، وہ بوڑھے بھی ہیں اور بھلے مانس بھی ۔ ہم دونوں بہنیں انہیں کوئی بات بتاتی ہی نہیں تھیں.....

” ایک روز میری بہن کسی گھر سے واپس آ رہی تھی ۔ برقعے کا نقاب نیچے تھا ۔ راستے

میں اسے یہ دکاندار مل گیا۔ اس نے برقعے میں بھی میری بہن کو پہچان لیا۔ اسے روک کر کہنے لگا۔ "تم دونوں بہنیں بیٹھی ہو۔ اس کی ازدواجی زندگی بچالو۔ آؤ میرے ساتھ۔ آدھے پونے گھنٹے بعد واپس آجانا"۔ بہن نے اسے دھتکارا تو اس نے دھمکی دی۔ "یاد رکھو۔ تمہارا رشتہ جہاں کہیں بھی ہوا میں وہاں جاکے کہہ دوں گا کہ اس لڑکی کے ساتھ میرے تعلقات ہیں"۔ میری بہن سٹپٹائی ہوئی گھر آئی اور یہ بات مجھے سنائی۔ میں تو ڈرپوک ہوں۔ وہ دلیر ہے مگر رو پڑی اور کہنے لگی کہ ہمارے ایک دو بھائی ہوتے تو آج ہمارا یہ حشر نہ ہوتا....

"دوسرے دن ہمارے ہاں میری اس بہن کے رشتے کے لیے مہمان آگئے۔ ابا جان نے صحن میں مرغی ذبح کی۔ میں اور بہن دیکھ رہی تھیں۔ میری بہن نے مجھ سے پوچھا۔ 'باجی! اس چھری سے انسان کی گردن کٹ سکتی ہے؟' میں نے جواب دیا۔ 'کیوں نہیں کٹ سکتی۔ ایک فٹ لمبی چھری ہے۔ یہ تو بیل کی بھی گردن کاٹ دے'۔ یہ بات مذاق کے رنگ میں ہوئی تھی مگر میں نے دیکھا کہ اس پر عجیب طرح کی خاموشی طاری ہوگئی اور وہ مرغی کے خون کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ چُپ چُپ ہی رہی۔ اُس کا رشتہ طے ہو گیا۔ بڑا اچھا گھرانہ ہے۔ اب تو معاملہ ہی چوپٹ ہو گیا ہے۔ رشتہ طے کر کے مہمان اگلے روز چلے گئے تو بہن نے مجھے کہا۔ 'اُس نے دھمکی دی تھی کہ جہاں تمہارا رشتہ ہوگا وہاں کہہ دوں گا کہ اس لڑکی کے میرے ساتھ تعلقات ہیں۔ اس نے تمہیں بھی اجاڑا ہے۔ مجھے بھی اجاڑے گا'۔ پھر وہ چُپ ہو گئی....

"وہ تین دن چُپ رہی۔ میں نے اسے ہر وقت گہری سوچ میں گُم دیکھا۔ ایک شام میں نے اسے باورچی خانے میں دیکھا۔ وہی چھری ہاتھ میں لیے کچھ سوچ رہی

تھی۔ میں باورچی خانے میں داخل ہوئی تو اس نے چونک کر چھری رکھ دی۔ پھر معلوم نہیں وہ کس وقت باہر نکل گئی۔ بہت دیر تک نہ آئی۔ امی نے دیکھا کہ اُس کا بُرقعہ کمرے میں پڑا ہے۔ وہ بُرقعے کے بغیر نکل گئی تھی۔ پھر واپس نہیں آئی۔"

میں چھری پر چونک پڑا تھا۔ میرے ذہن میں ایک چکر چل پڑا ۔۔۔ "وہ غصے میں پاگل ہو جاتی تھی۔ دلیر تھی۔ اس نے پوچھا تھا کہ اس چھری سے انسان کی گردن کٹ سکتی ہے؟ ۔۔۔ مقتول کی بلیک میلنگ اور دھمکیاں ۔۔۔ میری چھٹی حس بیدار ہو گئی۔

میں نے بڑی بہن سے پوچھا ۔۔۔ "وہ چھری کہاں ہے؟ جاؤ دیکھو ذرا، اگر مل جائے تو مجھے دکھاؤ"۔۔۔ وہ چلی گئی اور خاصی دیر سے آئی۔ کہنے لگی ۔۔۔ "امی کہتی ہیں کہ وہ چھری کئی روز سے نہیں مل رہی۔ اب چاقو استعمال کرتے ہیں" ۔۔۔ مجھے کچھ ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔

اتنی سی بات سُن کر میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ میں نے لڑکی کے باپ کو بلایا اور اسے کہا کہ آپ سب میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے تھانے چلیں۔ وہ میرے ساتھ چل پڑے۔ میں انہیں تانگے میں تھانے لے گیا۔ میں نے وہ چھری جو لاش کے قریب پڑی ملی تھی انہیں دکھائی اور پوچھا کہ وہ اسے پہچانتے ہیں؟

لڑکی کی ماں نے چھری کو بڑی غور سے دیکھا اور کہا ۔۔۔ "یہ تو ہماری ہی لگتی ہے اور یہ اُس روز سے غائب ہے جس روز سے میری بچی لاپتہ ہوئی ہے۔"

میں نے دوسری چیزیں بھی جو برآمد ہوئی تھیں، درازوں سے نکال کر میز پر رکھ دیں۔ ان میں ایک دوپٹہ تھا جس پر خون کے داغ دھبے تھے۔ سینڈل کا ایک پاؤں تھا اور چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ یہ چیزیں دیکھتے ہی لڑکی کی بڑی بہن چیخ کر بولی ۔۔۔ "ہائے میرے اللہ یہ تو میری گڈی کا سینڈل ہے۔ دوپٹہ بھی اسی کا ہے۔ چوڑیاں بھی اسی کی ہیں۔"

ماں پر تو سکتہ طاری ہو گیا۔ دوپٹے پر خون تھا۔ ساتھ چھری تھی۔ ماں اور بہن غش پہ غش نہ کھاتیں تو کیوں نہ کھاتیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ ان کی بچی قتل ہو گئی ہے۔ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ باپ دل گردے والا آدمی تھا۔ مجھے باہر لے گیا اور بڑے تحمل سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ لڑکی قتل ہو گئی ہے۔ دعا اور انتظار کریں۔ انہیں جھوٹی تسلیاں دے کر میں نے گھر بھیج دیا اور کہا کہ دعا کریں۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ ان کے ہاں بچی کی سلامتی کے لیے تین دن قرآن خوانی ہوتی رہی تھی۔

## جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے

میرے لیے یہ معمہ تھا کہ کیا لڑکی نے قتل کیا ہے یا وہ قتل ہوئی ہے؟ ایک قیاس یہ آتا تھا کہ مقتول نے لڑکی کو اغوا کرایا اور اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یہ ساتھی لڑکی کو لے اڑے مگر لڑکی گھر سے چھری لے کر کیوں گئی تھی؟ اُدھر میرے مخبر وغیرہ دو سکھوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے انہیں نئی لائن دی اور بتایا کہ اب دیہات میں کوئی شہری لڑکی ڈھونڈو۔ کھُرے صاف تھے۔ لڑکی کو زبردستی لے جایا گیا تھا اور کھُرے دیہات کی طرف گئے تھے۔ یہ کام میرے مخبروں کے لیے مشکل نہیں تھا۔

میں نے کھوجی کو پھر بلایا اور اسے کھُروں کے نشان دکھا کر کہا کہ وہ ذہن پر زور دے کر ان آدمیوں کے کھُروں کو پہچانے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ وہ تجربہ کار بوڑھا کھوجی تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ اُس روز مجھے واپس لے آئے تھے۔ ان میں ایک

کھرے کے متعلق مجھے کچھ شک ہے۔ جس طرف یہ کھرے جا رہے تھے اُدھر ایک پرانا وارداتیا رہتا ہے۔ آپ اسے جانتے ہوں گے۔ اسے بلّا وارداتیا کہتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ ان میں سے ایک کھُرا اس کا ہے۔ آپ کے یہاں آنے سے پہلے بھی میں یہ کھُرا دیکھ چکا ہوں۔ شاید تین سال گزرے دیکھا تھا۔"

رگھوناتھ کو میری اس نئی قیاس آرائی سے اتفاق نہیں تھا۔ کہنے لگا "ملک صاحب! آپ کا دماغ اچھا بھلا ہے۔ ذرا سوچیے کیا ایک پردہ نشین کنواری لڑکی رات کے وقت چھُری سے ایک غنڈے کو بھلا قتل کر سکتی ہے؟" میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔ "رگھوناتھ! جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ وہ ہتھیار ڈال بھی دیتی ہیں اور ہتھیار اٹھا کر ہم جیسوں کے پیٹ بھی پھاڑ سکتی ہیں۔"

میں نے بلّا وارداتیا ابھی دیکھا نہیں تھا۔ تھانے میں اس کا فوٹو اور پورا ریکارڈ موجود تھا۔ تین بار کا سزا یافتہ تھا۔ اس کا پیشہ رہزنی تھا اور دکانیں بھی توڑتا تھا۔

میں نے کسی کہانی میں آپ کو نامی گرامی ڈاکوؤں کے متعلق بتایا تھا، جنہیں پکڑنے کے لیے فوج بھی استعمال کی جاتی تھی۔ بلّا اس کلاس کا ڈاکو نہیں تھا۔ وہ درمیانہ درجے کا جرائم پیشہ تھا۔ ایسے لوگوں کو وارداتیا بھی کہا جاتا تھا۔ اس درجے کے جرائم پیشہ بردہ فروشی بھی کیا کرتے تھے۔ یہ اکثر دیہاتی علاقوں میں رہا کرتے تھے۔ وہ جس گاؤں میں رہتے تھے اس کی عزت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ گاؤں میں کوئی بدمعاشی نہیں کرتے تھے۔ جس گاؤں میں کوئی ایسا جرائم پیشہ رہتا تھا جسے دوسرے جرائم پیشہ جانتے ہوں تو وہ اخلاقاً اس گاؤں میں کوئی واردات نہیں کرتے تھے۔ اس گاؤں کے باشندے محفوظ رہتے تھے اور وہ اس کے جواب میں اپنے گاؤں کے وارداتیے کو

تحفظ دیتے تھے ۔ وہ چوری کا مال یا کوئی مغویہ عورت گاؤں میں لاتے تو گاؤں کا کوئی فرد اس کا سراغ نہیں دیتا تھا۔ لوگوں کے اس رویّے سے پولیس کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی تھی۔

مخبر وں کو میں نے بلّے وارداتیے کا گاؤں بتایا تو دوسرے ہی دن مجھے اطلاع مل گئی کہ بلّا ایک عورت لایا ہے جو ابھی اس نے آگے نہیں چلائی اور وہ خود بھی گاؤں میں ہے۔ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ یہ وہی لڑکی ہو گی جو لاپتہ ہو گئی ہے اور مقتول کو اسی لڑکی نے یا بلّے نے قتل کیا ہے ۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا معمہ بلّا ہی حل کرے گا۔ میں نے آٹھ کانسٹیبل تیار کر لیے ۔ انہیں گاؤں کو گھیرے میں لینے کی مشق کرائی ۔ رگھوناتھ کو اس کی ڈیوٹی سمجھائی ۔ کانسٹیبلوں کو جو رائفلیں دیں وہ ۳۰۳ نہیں تھیں یہ ۴۱۰ بور کی بک شاٹ رائفلیں تھیں جن کے کارتوس میں چھوٹے چھوٹے چھرّے ہوتے ہیں۔ یہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے فائر کی جاتی ہیں یا بھاگتے آدمی کو پکڑنے کے لیے ۔ یہ چھرّے صرف زخمی کرتے ہیں۔ میں نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ گاؤں سے نکل کر کوئی بھاگے تو گولی چلا دو لیکن ٹانگوں پر۔ میں کسی آدمی کو شدید زخمی یا ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

گاؤں چھ میل دور تھا۔ شام کے بعد ہم روانہ ہوئے ۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ ہماری راہنمائی کے لیے مخبر ساتھ تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم گاؤں میں داخل ہوئے ۔ دن بھر کے تھکے ہوئے دیہاتی سو گئے تھے ۔ رگھوناتھ نے کانسٹیبلوں سے گاؤں کی ناکہ بندی کر لی ۔ میں نے اپنے ساتھ صرف ایک کانسٹیبل رکھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے بلّے کے مکان کے پچھواڑے بھیج دیا تاکہ بلّا چھت سے اس طرف کود نہ جائے ۔ مخبر نے مجھے اس کا گھر دکھایا۔

میں نے دروازے پر دستک دی ۔ مجھے تین بار دستک دینی پڑی ۔ اندر سے آواز آئی ۔۔۔ "کون ہے او" ۔۔۔ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ۔۔۔ "ارے کھولو نا یار۔

یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے"۔

دروازہ کھلا۔ ایک آدمی باہر آیا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ مخبر نے کہا ۔۔۔ "یہی ہے" ۔۔۔ اور مخبر فوراً پیچھے ہٹ گیا تاکہ بِلا اسے پہچان نہ سکے۔

"او ہو" ۔۔۔ بلّے نے عام سے لہجے میں کہا ۔۔۔ "داروغہ صاحب۔ فرمائیے حضور!"

"بلّے!" ۔۔۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ۔۔۔ "میں لڑکی کو لینے آیا ہوں"۔

"کون سی لڑکی حضور؟"

"تمہارے پاس کتنی لڑکیاں ہیں؟" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ایک ہی ہوگی۔ اسے میرے حوالے کر دو"۔

"ایک بھی نہیں سرکار!"

"دیکھو بلّے" ۔۔۔ میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اس کا سر ہلایا اور کہا ۔۔۔ "میں لڑکی کو لینے آیا ہوں۔ بہتر یہ ہوگا کہ میرے ساتھ صرف لڑکی جائے، اس کے ساتھ تمہاری لاش نہ جائے۔ میرے پاس ریوالور ہے۔ گاؤں پولیس کے گھیرے میں ہے۔ میری اتنی پاور ہے کہ تمہیں یہاں کھڑے کھڑے گولی مار دوں اور تمہارے گھر سے لڑکی برآمد کر کے لے جاؤں"۔

میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ کم و بیش چالیس سال کی عمر کا بارعب چہرے والا آدمی تھا۔ اگر اس کا تعارف کرائے بغیر اسے میرے سامنے لایا جاتا تو میں ذرا مشکل سے ہی یہ رائے دیتا کہ یہ شخص جرائم پیشہ ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "سوچو مت۔ لڑکی دے دو"۔

اس کے ہونٹوں پہ ایسی مسکراہٹ آ گئی جس میں کوئی ڈر اور گھبراہٹ نہیں بلکہ

طنز سی تھی۔ اس نے مسکراہٹ سے مجھے چیلنج کیا تھا۔ دھیمی سی آواز میں بولا "آپ نے فرمایا تھا کہ لڑکی کے ساتھ تمہاری لاش نہ جائے لیکن عالی جاہ! لڑکی کے ساتھ میری لاش ہی جائے گی"۔

# اسلام کا رشتہ

میں نے اسے ڈرانے کے لیے اپنے بیلٹ سے بندھے ہوئے ریوالور پر ہاتھ رکھا تو اس نے بڑے تحمل سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹارچ تھی۔ بلتے نے بجلی کی تیزی سے اپنا دوسرا ہاتھ کرتے کے اندر ڈال کر ڈیڑھ فٹ لمبا خنجر نکال لیا۔ اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا "گولی کھا کر ایک وار تو ضرور کروں گا۔ لڑکی کے ساتھ دو لاشیں جائیں گی"۔

میرے کانسٹیبل نے رائفل کی نالی اس کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا "ہتھیار پھینک دو"۔

میں نے کانسٹیبل کو پیچھے کر دیا اور بلتے کو دوستانہ لہجے میں کہا "تم پاگل ہو جو پولیس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو"۔

"یہ سپاہی مسلمان ہے؟" اس نے پوچھا۔ میں نے بتایا کہ ہاں یہ مسلمان ہے تو بلتے نے کہا "سنو دارو غہ جی! نہ آپ پستول چلائیں گے نہ میرا خنجر چلے گا۔ آپ بھی مسلمان ہیں، میں بھی مسلمان ہوں اور لڑکی بھی مسلمان ہے۔ وہ اندر ہے۔ اگر سچے مسلمان ہو تو میری ایک بات سن لو۔ اگر بات آپ کے دل کو لگی تو دونوں کی مشکل آسان ہو جائے گی، ورنہ لڑکی کے ساتھ دو نہیں تو ایک لاش ضرور جائے گی"۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس کی بات سُن لی جائے۔ مجھے اپنے اُوپر یہ اعتماد تھا کہ اگر لڑکی اس گھر میں ہے تو اسے تو میں لے ہی جاؤں گا۔ اس آدمی کو بولنے کا موقع دے دوں۔ مجھے یہ توقع تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرلے گا اور کہے گا کہ لڑکی کو اس نے اغوا نہیں کیا بلکہ لڑکی خود اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی تلاش میں آیا ہوں۔ یہ کوئی اور بھی ہوسکتی تھی۔

بِلّا مجھے اندر لے گیا۔ لالٹین جلائی اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ کانسٹیبل کو میں نے صحن میں کھڑا کر دیا۔ بِلّے نے جب اپنی بات کہی تو میرا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ میں یہ بھی سوچوں کیا یہ شخص مجھے بدّھو سمجھ کر دھوکا دینے کا نیا طریقہ اختیار کر رہا ہے؟ لیکن میرے ذہن میں یہ خیال بھی آجاتا تھا کہ میں خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں، یہ وارداتیا جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہے۔ اس نے بات شروع کی ہی تھی کہ میں نے اسے ٹوک کر کہا۔ "پہلے مجھے لڑکی دکھا دو۔ ہوسکتا ہے یہ وہ لڑکی ہی نہ ہو جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں"۔

"یہ وہی ہے داروغہ جی!" اس نے کہا۔ "جس نے کوٹھی میں ایک شہری بدمعاش کو قتل کیا ہے"۔ اس نے نام بتایا تو مجھے یقین ہو گیا۔

"ملک صاحب!" ــــ اس نے داروغہ سے مجھے ملک بنا دیا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا ــــ "وارداتیوں کا ریکارڈ آپ کے پاس ہوتا ہے اور تھانیداروں کا ریکارڈ وارداتیوں کے پاس ہوتا ہے۔ کسی داروغے کا نام لو۔ میں بتا دوں گا کہ وہ کتنی قیمت کا داروغہ ہے۔ آپ کے متعلق پتہ چلا ہے کہ سرکار کے پکے مسلمان ہیں۔ سچی بات ہے میں نے نہیں مانا۔ مسلمان داروغہ صرف داروغہ ہوتا ہے مسلمان نہیں ہوتا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ جناب اپنی قیمت وصول کریں گے یا جناب کو اپنا ایمان عزیز ہے؟

میں نے اس پر واضح کر دیا کہ مجھے کیا غرض ہے اور میں کیا چاہتا ہوں۔

اس نے کہا ــ "اللہ آپ کا ایمان اور پکا کرے۔ اب میرا فیصلہ سن لیں۔ لڑکی آپ کے ساتھ بھاگنے نہیں جائے گی۔ عدالت میں نہیں جائے گی۔ اگر آپ اپنا زور استعمال کریں گے تو آپ کو لڑکی کی لاش ملے گی، شاید میری لاش بھی.... ذرا اس پر غور کرو ملک صاحب! میں نے اتنا قیمتی مال اتنے دنوں سے اندر کیوں رکھا ہوا ہے؟ کیا میں اتنا اناڑی ہوں کہ شہر میں قتل کی تفتیش ہو رہی ہے، کھوجی کھرے اٹھا رہے ہیں اور میں اتنے قیمتی قاتل کو گھر میں رکھے ہوئے ہوں؟ میں اناڑی نہیں ہوں ملک صاحب! اکتالیس برس عمر ہو گئی ہے۔ چھبیس برس سے وارداتیں کر رہا ہوں۔ گیارہ سال اڑھائی مہینے قید بامشقت کاٹ چکا ہوں۔ پولیس اور جیل خانے کی حوالاتوں میں جو وقت گزارا ہے وہ پانچ سال سے کم نہیں ہو گا۔ پھر خود ہی سوچو ملک صاحب! میں نے مال آگے کیوں نہیں چلایا؟"

"خدا کے لیے بلتے!" میں نے جھنجلا کر کہا ــ "مطلب کی بات پر آؤ اور بات ذرا جلدی ختم کرو۔ مانتا ہوں تم استاد ہو لیکن اناڑی میں بھی نہیں ہوں۔"

"تو سنو دار و غہ جی!" اس نے کہا ــ "یہ لڑکی جوان، خوبصورت اور کنواری ہے۔ یہ ہیرا ہے جسے میں کسی بھی نواب، راجے یا مہاراجے کے پاس لے جاتا تو روپوں کی تھیلیاں لے آتا۔ اگر منڈی میں لے جاتا تو منہ مانگے دام ملتے لیکن لڑکی کو بلا کر پوچھ لو۔ درمیان میں قرآن رکھ دو۔ میں نے اس لڑکی کو عورت ذات سمجھا ہی نہیں۔ اس کے جسم کو یہی ہاتھ لگایا تھا جب اسے اٹھا کر زبردستی گاؤں میں لایا تھا۔ اس روز سے سوچ رہا ہوں کہ اس لڑکی کا کیا کروں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اللہ سبب بناتا ہے۔ آپ کو اللہ نے میرے پاس بھیج دیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں کہ میری منشا پوری ہوتی ہے یا نہیں....

"قصہ یوں ہُوا کہ وقوعہ کی رات، میں اپنے ایک دوست کے ساتھ شہر سے آ رہا تھا۔ اس کوٹھی کے سامنے سے گزرے تو اندر سے کسی کی آواز آئی — "ہائے، مار ڈالا۔ کوئی پکڑنا اسے!" — مجھے معلوم تھا کہ یہ کوٹھی نئی بنی ہے اور ابھی خالی ہے۔ میرا کسب جانتے ہیں کیا ہے۔ کوٹھیوں پر نظر رکھتا ہوں۔ آواز سُن کر ہم دونوں پھاٹک کے اندر چلے گئے۔ ایک عورت کمرے سے بھاگتی ہوئی برآمدے میں آئی۔ اندھیرا تھا مگر مرد عورت پہچانے جاتے تھے۔ عورت ہمیں دیکھ کر برآمدے میں ہی بُت بن گئی۔ فوراً بعد کمرے سے ایک آدمی دروازے میں آیا۔ اس کے منہ سے بڑی ڈراؤنی سی آواز نکلی اور وہ دروازے میں گر پڑا۔ میرے دوست نے لڑکی کو پکڑ لیا اور میں نے ماچس جلا کر اس آدمی کو دیکھا۔ خون تھا کہ ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔ لڑکی تو جیسے کھڑے کھڑے مر گئی تھی۔ پتھر کے بُت کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے دوپٹے اور شلوار پر خون کے چھینٹے تھے....

"اس سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ نہیں بولی۔ ذرا تسلی دلاسہ دیا تو اس کے منہ سے آہستہ سے نکلا — "تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے؟ پولیس مجھے پھانسی دے دے گی؟" — میں نے پوچھا کہ اس آدمی کو کس نے مارا ہے؟ اس نے کہا — "میں نے اسے چھُری سے مارا ہے" — میں نے ماچس جلا کر دیکھ لیا تھا کہ لڑکی نوجوان اور خوبصورت ہے اور اس کے ہوش اڑے ہوئے ہیں۔ قتل تو جابر مرد بھی ہضم نہیں کر سکتے۔ میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے اسے قتل کیوں کیا ہے۔ میں نے صرف یہ پوچھا کہ تم اس کوٹھی میں رہتی ہو؟ اس نے کہا، نہیں، میں شہر میں رہتی ہوں۔ اس کی دکھتی رگ پکڑ کر میں نے کہا — "یہاں کھڑی مت رہو، ورنہ پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ آؤ ہمارے ساتھ ہم تمہیں شہر کے باہر باہر سے گھر پہنچا دیں گے"....

"وہ سخت خوفزدہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ قتل کر کے قاتل کی اندر سے کیا حالت ہو جاتی ہے۔ یہ تو نوجوان لڑکی تھی۔ وہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑی۔ میں نے اس کی قیمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ اس امید پہ ہمارے ساتھ ہو گئی تھی کہ ہم اسے باہر باہر سے اور اندھیرے اندھیرے میں گھر پہنچا دیں گے۔ وہ ہم دونوں کے درمیان چلتی رہی۔ ہم نے اس سے کوئی بات نہیں پوچھی اور نہ اس نے کوئی بات کی۔ ہم اسے شہر سے دُور ویران علاقے میں لے گئے....

"ایک جگہ وہ اچانک رک گئی اور بولی۔ "تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میرا گھر ادھر تو نہیں"۔ میں نے اسے کہا کہ گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہیں پولیس سے بچانے کی ترکیب کر رہے ہیں مگر اس کا دماغ ٹھکانے آ گیا تھا اور اسے شک ہو گیا تھا کہ ہم اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں۔ اس نے ہمارے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے بہت فریب دیئے لیکن وہ نہ مانی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ بیٹھ گئی۔ مجھے زبردستی کرنی پڑی۔ اسے اٹھانے لگا تو وہ جھاڑی پر لیٹ گئی۔ ہم دونوں نے اسے کھڑا کیا اور گھسیٹنے اور دھکیلنے لگے۔ اس نے رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دُور لے جا کر میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ میں ایسا قیمتی دانہ بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا....

"میں اسے یہاں لے آیا۔ وہ چیختی چلاتی تھی۔ ایک بار بے ہوش بھی ہو گئی۔ بڑی ہی مشکل سے میں نے اسے سنبھالا۔ آخر اس نے کہا ـــ "میں نے اپنی اور اپنی بہن کی عزت بچانے کے لیے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اپنا آپ تمہارے حوالے کر دوں گی؟ میں مسلمان باپ کی بیٹی ہوں"ـــ اس نے یہ بات ایسے لہجے میں کہی کہ مجھ پر جیسے کسی نے پانی کا مشکیزہ خالی کر دیا ہو۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے پوری بات سنا دے۔ اور

اس نے پوری بات سنا دی۔"

## کنواری لڑکی رہزن کی پناہ میں

بِلّے نے مجھے وہی کہانی سنائی جو میں اس لڑکی کی بڑی بہن سے دلہن کے خاوند سے اور بیگی سے سن چکا تھا۔ یہ آپ کو بھی سنا چکا ہوں۔ دوبارہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی مقتول کو اس کوٹھی تک کس طرح لائی اور اسے قتل کس طرح کیا؟ آگے چل کر لڑکی کی زبانی سناؤں گا۔ پہلے بلّے وارداتیے کی بات مکمل کر لوں۔ اس نے کہا۔" لڑکی نے کہا کہ ہم دو بہنیں ہیں۔ بھائی کوئی نہیں۔ باپ بوڑھا ہے، اسی لیے ایک غنڈے نے اتنی ڈھٹائی سے ہمیں پھانسنے کے جتن کیے، میری بہن کو اجاڑ دیا اور مجھے اجاڑنے کی دھمکی دی اور میرے بہنوئی نے اس شہ پر میری بہن کو میکے بٹھا دیا کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں... میں اپنی بڑی بہن کا بھائی بن گئی... لڑکی کے ان الفاظ نے اس کی غیرت مندی اور دلیری سے مجھے انسان بنا دیا۔ اکتالیس سال کی عمر میں پہلی بار میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور اپنے آپ سے کہا — او بلّے! شرم کر۔ کیا تو اس غیرت مند لڑکی پر جبر کر کے فخر کرے گا جس کا کوئی بھائی نہیں ہے....

"اللہ گواہ ہے داروغہ جی! میں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔" سن بچی! یہ بلّا ڈکیت تیرا بھائی ہے۔ یہ گنہگار تیرا باپ ہے۔ تو میرے قبضے میں نہیں میری پناہ میں ہے تیرا جسم مجھ پر حرام ہے۔ مجھ پر بھروسہ کر اور مجھے سوچنے دے کہ تجھے پولیس سے کیسے بچاؤں"۔ لڑکی پھر بھی ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ڈر دور کر دیا۔ میری دو بیٹیاں

ہیں ایک کے ساتھ نکاح پڑھوایا تھا، دوسری بے نکاحی رکھی ہوئی ہے۔ دونوں میری غلام ہیں۔ انہیں لڑکی کی ساری بات سنا کر لڑکی ان کے حوالے کر دی۔ انہوں نے لڑکی کو نہلا دھلا کر اسے اپنے سینے میں ڈال لیا.....

"میرے لیے آسان طریقہ یہ تھا کہ رات کے وقت لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ آتا لیکن پتہ چلا کہ لڑکی کا دوپٹہ کہیں رہ گیا ہے اور ایک سینڈل بھی کہیں رہ گیا ہے اور اس نے بتایا کہ چھری کوٹھی میں رہ گئی ہے تو میں نے لڑکی کو گھر لے جانے کا ارادہ بدل دیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پولیس انہی چیزوں سے سراغ لگایا کرتی ہے۔ اگر کوئی اور تھانیدار ہوتا تو میں فکر نہ کرتا۔ آپ کے متعلق مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کی تفتیش سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ میں خود کئی بار ایسی ہی چیزوں سے پکڑا گیا ہوں۔ میں نے لڑکی کی کلائی دیکھی۔ اس میں دو چوڑیاں تھیں، اور کلائی زخمی تھی۔ میں نے پوچھا چوڑیاں کتنی تھیں؟ اس نے بتایا کہ پانچ تھیں۔ باقی جائے واردات پر ٹوٹی ہوں گی یا جب راستے میں ہم نے اسے گھسیٹا تھا۔ میں نے سوچا کہ بہت بُرا ہُوا.....

"میں نے لڑکی کو سمجھایا کہ مجھے تفتیش کا رُخ دیکھنے دو اور کچھ دن انتظار کرو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ بہت کوشش کی کہ آپ کی تفتیش کا رُخ معلوم ہو جائے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ لڑکی کو یہ غم کھا رہا تھا کہ اس کے والدین اور بہن بہت پریشان ہوں گے۔ اس معاملے میں میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ قتل جیسے سنگین جرم کی سزا سے بچنے کے لیے کوئی ایک دُکھ تو جھیلنا ہی پڑے گا۔ میں تفتیش کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ اچانک آ گئے اور میں نے مان لیا کہ آپ کے متعلق جو کچھ سنا تھا وہ بالکل صحیح ہے.....

"اب میری وہ بات سنیں جو میں آپ کے دل میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں کہ آپ پولیس کے افسر ہیں۔ فرض کریں کہ آپ اس لڑکی کے باپ ہیں۔ فرض کریں آپ بوڑھے بھی ہیں اور شریف بھی۔ آپ کا کوئی بیٹا نہیں۔ آپ کسی غنڈے کے منہ نہیں آسکتے۔ آپ کی بیٹی کے ساتھ کوئی غنڈہ یہی سلوک کرتا ہے جو اس لڑکی کے ساتھ ہُوا اور لڑکی اس غنڈے کو قتل کر کے آپ کے پاس آجاتی ہے۔ کیا آپ اپنی بیٹی کو پولیس کے حوالے کر دیں گے"؟

مجھے سوچ کر جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکی نے جسے قتل کیا تھا وہ بدکار تھا، غنڈہ تھا، شریف لڑکیوں کی زندگی تباہ کرنے کا گنہگار تھا۔ لڑکی نے اسے قتل کر کے میری روح کو بھی خوش کر دیا تھا مگر میری ایک مجبوری یہ تھی کہ میں پولیس انسپکٹر تھا جس کی نظر میں لڑکی کا جرم یہ تھا کہ اس نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرا فرض یہ تھا کہ قاتل کو گرفتار کروں، استغاثہ تیار کروں اور عدالت میں پیش کروں۔ یہ کام قاتل کا ہے کہ وہ ثابت کرے کہ اس نے اشتعال کے زیرِ اثر قتل کیا ہے یا وہ قتل سے منکر ہو جائے۔

میری دوسری مجبوری یہ تھی کہ میں ڈیوٹی کے معاملے میں دیانت دار تھا۔ میں نے تین چار مسلمان ملزموں کے کیسوں میں انہیں بچانے کے لیے ہیرا پھیری کی تھی لیکن ایسا کبھی نہیں کیا تھا کہ ملزم کو گرفتار ہی نہ کیا ہو۔ ملزم کو بہر حال پکڑنا اور عدالت میں لے جانا تھا۔ مجھے نوکری بھی کرنی تھی۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں میں پہلے ہی مسلمانوں کی حمایت کا مجرم تھا اور میرے خلاف اُوپر انگریز افسروں تک رپورٹیں پہنچائی گئی تھیں لیکن مجھ میں کچھ ذہانت اور محکمانہ اوصاف تھے جن کی بدولت میں بچا رہا مگر مسلم دوستی کی سزا مجھے ضرور بھگتنی

پڑی۔ میں پولیس انسپکٹری میں ہی ریٹائر ہوا۔ مجھے ترقی سے محروم رکھا گیا۔ مجھ سے جونیئر غیر مسلم ایس۔پی کے عہدے تک پہنچے۔

میں نے بِلّے کو خوب داد دی اور اسے اپنی مجبوری بتا کر کہا کہ لڑکی کو میں حراست میں لے لیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ استغاثہ اتنا کمزور رکھوں گا کہ لڑکی سیشن سپرد بھی نہیں ہوگی۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" بِلّے نے کہا۔" لڑکی تھانے میں بند ہوئی عدالت میں گئی۔ اخباروں میں اس کا نام چھپا پھر پیچھے رہ کیا گیا؟ بری ہو بھی گئی تو کوئی اسے قبول کرے گا؟ شریف باپ مر نہیں جائے گا؟"

یہاں میں ایک بات کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کے دور کے نوجوان یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک پیشہ ور رہزن نے اس قسم کے اخلاق کا مظاہرہ کیا اور وہ ایک تھانیدار کے ساتھ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ آج کی اُبھرتی ہوئی نسل شاید اس پر بھی یقین نہ کرے کہ ایک پردہ نشین لڑکی نے ایک غنڈے کو قتل کر دیا تھا۔ میں ان لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں جو اس واقعہ کو ناقابلِ یقین سمجھتے ہوں گے۔ یہ لوگ اِس دور میں پیدا ہوئے ہیں جس میں فیشن اور جنسیت کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ عزت اور غیرت پرانے زمانے کی بیہودہ چیزوں میں شامل ہو گئی ہیں۔ میری عمر کے لوگ جانتے ہیں کہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے پیشہ ور ڈاکوؤں اور رہزنوں میں بھی رکھ رکھاؤ اور خلوص تھا۔ ڈکیتی اور رہزنی کو پیشہ سمجھتے اور جہاں ایثار کی ضرورت پڑتی وہ جان تک کی بازی لگا دیتے تھے۔ زبان کے پکے اور دوستی میں کوئی ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ آجکل کے زمانے میں جہاں مذہب کے پردے میں جھوٹ، سیاست کے پردے میں جھوٹ، تعلیم کے پردے میں جھوٹ، اپنے پرائے سے جھوٹ، گھر گھر، گلی گلی جھوٹ، دغا اور مکر و فریب ہے وہاں لوگ کیسے یقین

کریں گے کہ ہمارے وقتوں میں ڈاکو بھی سچ پہ قربان ہوجایا کرتے تھے۔ آج میں وہ باپ اور بھائی دیکھ رہا ہوں جو اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو نئے فیشن میں نیم عریاں کرکے ان کا تعارف اپنے افسروں سے کراتے اور ان کی نمائش کرکے فخر کرتے ہیں کہ وہ ماڈرن ہیں۔ میں آپ کو وہ رہزن دکھا رہا ہوں جو ایک پردہ دار لڑکی کی عزت کی خاطر اپنی جان پیش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس دَور کے جرائم پیشہ لوگوں کا کردار اس لیے پختہ تھا کہ انہیں سیاسی لیڈروں نے سیاست کے میدان میں سیاسی غنڈہ گردی کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔

میں نے بلّے کی بات سمجھ لی اور اسے بتایا کہ کیس رجسٹر ہوچکا ہے، رپورٹ اُوپر جا چکی ہے۔ قتل شہر میں ہوا ہے۔ دو اخباروں میں خبریں چھپ چکی ہیں۔ دونوں خبروں کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ پولیس انسپکٹر احمد یار خان سرگرمی سے تفتیش کر رہا ہے۔ تا حال کوئی ملزم گرفتار نہیں ہوسکا۔ اُس دَور میں آج کی طرح قتل کی وارداتوں کی بھرمار نہیں تھی۔ کہیں قتل کی واردات ہوتی تھی تو سارے ملک کو خبر ہوجاتی تھی۔ میں نے بلّے کو یہ بھی بتایا کہ مَیں غیر مسلموں میں نوکری کر رہا ہوں۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی ہندو ہے۔

بلاّ شاید میری بات سمجھ گیا تھا۔ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "میرا آپ پہ کوئی زور نہیں۔ میں مجرم ہوں، آپ داروغہ ہیں۔ قتل کا ملزم میرے گھر میں ہے۔ آپ کے ساتھ پولیس کی نفری ہے۔ اگر آپ لڑکی کو زبردستی لے جائیں گے تو مَیں مقابلہ کروں گا۔ مَیں مارا جاؤں گا۔ شاید آپ بھی مارے جائیں لیکن ساری پولیس نہیں ماری جائے گی۔ لڑکی کو پولیس ضرور لے جائے گی۔ میں خوش تھا کہ مسلمان داروغہ غیرت میں آجائے گا۔"

مجھے آج بھی اس کا وہ چہرہ یاد ہے جو یکلخت چمک اٹھا اور اس نے کہا۔ "دیکھ

میری آنکھ میں آنکھ ڈال کے دیکھ۔ میں گنہگار ہوں اور نیکی کر رہا ہوں۔ تو نیک ہے مگر نیکی کرنے سے ڈر رہا ہے۔ یہ نوکریاں اس دنیا میں دھری رہ جائیں گی۔ آ ملک، ہمت کر۔ میں تجھے ایک راستہ بتاتا ہوں۔"

اس نے مجھے ہلا ڈالا۔ ایسی بے تکلفی سے جذباتی رنگ میں بات کی کہ میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔" ہاں، مجھے کوئی راستہ بتاؤ۔ میں مان لوں گا۔"

" مجھے ہتھکڑی لگا لو۔" اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے کہا۔" اور لکھ لو، بِلّا قاتل ہے۔ مقدمہ قائم کرو۔ اس میں تھوڑی سی چھوٹ میرے وکیل کے لیے رکھ دو۔ مقدمہ سارا جھوٹا ہو گا۔ لیکن سچا کر کے عدالت میں پیش کرو۔ صرف اتنا کرم کرنا کہ موقعہ کا گواہ کوئی نہ بنانا"۔ وہ ذرا سا چپ ہو گیا اور پھر بھڑک کر بولا۔" بنا لو مقدمہ۔ پورا بنا دو۔ اپنے اوپر کچھ نہ لو۔ بِلّا پاپی پھانسی چڑھ گیا تو کیا قیامت آ جائے گی۔ اس بچی کو بچا لو۔"

مجھے اندر بیٹھے بہت دیر ہو گئی تھی۔ رگھوناتھ نے صحن سے مجھے آواز دی۔ اسے بجا طور پر شک تھا کہ مجھے اندر ہی کسی نے ختم نہ کر دیا ہو۔ میں باہر نکلا اور کچھ سوچے سمجھے بغیر رگھوناتھ سے کہا۔" بھائی میرے یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ قتل بِلّے نے کیا ہے۔ میں نے ریوالور کنپٹی پر رکھ کر اسے اقبالی کرا لیا ہے۔ میں اس کا اور لڑکی کا بیان لے رہا ہوں۔ تم ذرا باہر نظر رکھو۔ یہ کوئی اور ہی چکر نہ ہو۔"

وہ باہر چلا گیا اور میں اپنے ہی منہ سے نکلی ہوئی بات کے چکر میں آ گیا۔ میں نے یہ فقرہ غیر ارادی طور پر کہہ دیا تھا۔ یہ شاید میرے سینے کا مسلمان بول رہا تھا۔ بہرحال میں اپنی سروس کا سب سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا۔ اندر جا کر بِلّے سے کہا۔" ٹھیک ہے بِلّے! ایسے ہی کرتے ہیں جیسے تم نے بتایا ہے۔ لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔ اس

کی باتیں سُن کر اگلا قدم اُٹھائیں گے"۔

وہ اُٹھا اور میری ٹھوڑی کو پکڑ کر بولا" ملک صاحب! دارو غوں والا حرامی پنا تو نہیں کرو گے"؟

## غیر آباد کوٹھی میں چوڑیاں ٹوٹ گئیں

میری ہنسی نکل گئی اور وہ جا کر لڑکی کو لے آیا۔ میں نے جب لڑکی دیکھی تو میں بِلّے کے کردار کا قائل ہو گیا۔ لڑکی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی اور عمر اٹھارہ انیس سال۔ بِلّے نے ٹھیک کہا تھا کہ ایسا قیمتی مال کون واپس کرتا ہے۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر بِلّے کے پیچھے ہو گئی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ بِلّے نے بھی اسے کہا کہ ڈرو نہیں۔ یہ تمہیں گرفتار نہیں کریں گے۔ میں نے اسے سامنے بٹھا کر اور یہ یقین دلا کر کہ اسے آج ہی رات اس کے گھر لے جائیں گے، کہا کہ وہ سارا واقعہ سُنا دے۔

اُس نے وہی قصّہ سنایا جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ وہ اپنے بہنوئی کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ اُس کی بہن کو وہ دکاندار بلیک میل کر رہا ہے مگر یہ وہمی آدمی نہ مانا۔ وہ دکاندار کے پاس چلی گئی اور اس کی مِنّت کی کہ وہ اُس کے بہنوئی کے دل سے وہم نکال دے مگر وہ اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ لڑکی اپنی بہن کا رونا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دکاندار کے پاس پھر گئی اور اس کی مِنّت کی۔ دکاندار (مقتول) نے یہ شرط پیش کی کہ اپنی بہن کی جگہ یہ لڑکی اُس کے ساتھ دوستی کر لے۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے بہنوئی سے معافی بھی مانگ لے گا اور اس کی بہن کے خلاف یہ جھوٹا الزام دُور کر دے گا۔ لڑکی جل اُٹھی

مگر وہ لڑکی تھی۔ اپنا خون پیتی واپس آگئی۔

ایک روز مقتول نے لڑکی کو راستے میں روک لیا اور اپنی شرط دہرانے کے علاوہ یہ بھی کہا کہ جہاں تمہارا رشتہ طے ہوگا وہاں جا کے کہہ دوں گا کہ اس لڑکی کے میرے ساتھ تعلقات ہیں۔ اس لڑکی نے اپنی بہن کو ایک اور واقعہ نہیں سنایا تھا۔ لڑکی اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ بازار گئی۔ سہیلیوں کو کچھ خریدنا تھا وہ اسے ساتھ لے گئی تھیں۔ مقتول کی دکان کے سامنے والی دکان پر سہیلیاں رُک گئیں۔ مقتول نے اس لڑکی کو پہچان لیا اور باہر آکر اسے کہا۔ "میری ایک بات سُن کے جانا۔"

لڑکی اس کی دکان میں چلی گئی۔ مقتول نے بڑے پیار سے باتیں کیں اور پھر وہی جال پھینکا۔ لڑکی نے اسے دھتکارا تو مقتول نے کہا۔ "تم کس پر ناز کرتی ہو؟ میں تمہارے گھر جا کر تمہیں اُٹھا لاؤں تو تمہارے گھر میں کوئی آدمی نہیں جو مجھے روک سکے۔ تمہارا باپ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ تم لوگوں نے اس کا کیا بگاڑ لیا ہے جس نے تمہاری بہن کو طلاق دیئے بغیر تمہارے حوالے کر دیا ہے؟ میری بات مان جاؤ۔"

لڑکی کو کس مپرسی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک شعلہ سا بھڑکا۔ اس نے مقتول سے کہا۔ "مجھے ایک دو دن سوچنے کی مہلت دو۔"

اس سے اگلے روز ان کے ہاں مہمان آئے۔ لڑکی پر پاگل پن کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اس غنڈے کو یہ بتاؤں گی کہ جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے وہ اپنی عزت مردوں کی طرح بچا سکتی ہیں۔ اُس نے اپنے باپ کو چھُری سے مرغی ذبح کرتے دیکھا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ اس کی بہن نے مجھے بتایا تھا کہ اس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی، وہ ہر لمحہ یہی سوچتی رہی کہ کہاں اور کس طرح انتقام لے۔

اُس نے اپنے انجام کے متعلق بالکل نہیں سوچا۔ اس کے دماغ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ اس سلسلے میں بات کر لیتی تو اس ارادے سے باز آجاتی۔ اس کے ذہن میں لاوا پکتا رہا اور ایک روز وہ کسی سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے مقتول کی دکان پر چلی گئی۔ اسے کہا کہ میں تمہارے ساتھ دوستی کر لوں گی لیکن قسم کھاؤ کہ تم میرے بہنوئی کے دل سے میری بہن کے خلاف غلط فہمی دُور کر دو گے۔

اُس نے ایک کی بجائے دس قسمیں کھائیں اور اُسی وقت اسے ایک ہوٹل کے کمرے میں لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لڑکی نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ مقتول نے اسے دو اور جگہیں بتائیں۔ لڑکی نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کے مطابق یہ جگہیں بھی موزوں نہیں تھیں۔ آخر مقتول نے اسے بتایا کہ شہر سے باہر ایک کوٹھی خالی پڑی ہے لیکن وہ صرف رات کے لیے موزوں ہے۔ لڑکی نے اس سے اس کوٹھی کے متعلق بہت کچھ پوچھا اور طے پایا کہ لڑکی شام کے بعد ایک جگہ پہنچ جائے گی۔ مقتول اسے کوٹھی تک لے جائے گا۔

رات ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان لڑکی نے باورچی خانے سے چھُری اٹھائی اور شلوار کی نیفے میں اُڑس لی۔ وہ گھر والوں سے چوری چھپے کے بغیر گھر سے نکل گئی۔ لڑکی نے ان الفاظ میں بیان دیا ــ "اِس وقت وہ وقت یاد کرتی ہوں تو میرا دل کانپ جاتا ہے لیکن اُس وقت میرے دل میں کوئی ڈر نہیں تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے اِس دنیا میں ایک وہ بدبخت دکاندار ہے اور دوسری میں ہوں اور مجھے اس آدمی کو ختم کرنا ہے تاکہ دنیا میں اکیلی رہ جاؤں۔ میں جب بازار سے گزری تو دکانیں بند ہو چکی تھیں یا بند ہو رہی تھیں۔ مَیں مردوں کے درمیان چلی جا رہی تھی۔ مجھے ذرّہ بھر

احساس نہیں تھا کہ میں پردہ کرنے والی لڑکی ہوں اور نہ مجھے یہ خطرہ تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور کیا کرنے جا رہی ہوں ۔ آج سوچتی ہوں کہ وہ اپنے ساتھ ایک دو دوستوں کو بھی لے آتا تو میرا کیا حشر ہوتا۔ میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ جو کرنا تھا وہ میں سوچ چکی تھی۔"

مقتول مقررہ جگہ پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک تانگہ لیا اور لڑکی کو ساتھ بٹھا کر شہر سے باہر لے گیا۔ وہ کوٹھی سے دُور ہی تانگے سے اُترے ۔ آگے اندھیرا تھا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آگے آگے مقتول کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ لڑکی اس کے پیچھے تھی۔ وہ ایک کمرے میں چلے گئے۔ مقتول آگے تھا۔ وہ رُکا اور لڑکی کی طرف گھوما ۔ لڑکی نے ناف سے چھُری نکالی۔ یہ مضبوط، چوڑی اور دس انچ لمبے بلیڈ والی چھُری تھی مقتول اس کی طرف گھوما ہی تھا کہ لڑکی نے پُوری طاقت سے چھُری اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ مقتول اس اچانک وار سے ضرور سُن ہو گیا ہوگا۔ لڑکی نے چھُری کھینچ کر دوسرا وار کیا۔ اُس وقت مقتول نے چھُری کو پکڑ لیا۔ لڑکی نے زور سے چھُری کھینچی۔ مقتول کی ہتھیلی پر جو کٹ تھا وہ اسی وار کا تھا۔

لڑکی نے تیسرا وار کیا اور چھُری کھینچ رہی تھی کہ مقتول نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ لڑکی کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ لڑکی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ مقتول واہی تباہی بکتا رہا۔ لڑکی نے کلائی چھڑا لی اور چھُری پھینک کر باہر کو بھاگی۔ مقتول نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ لڑکی کے کندھے پر پڑا۔ یہ اُس کا خون سے بھرا ہُوا ہاتھ تھا۔ لڑکی اُس کے ہاتھ نہ آئی۔ مقتول دروازے تک اُس کے پیچھے آیا اور وہیں گر پڑا۔ پیٹ اور سینے میں اتنے گہرے زخم کھا کر وہ کیسے کھڑا رہتا۔ مقتول نے گرتے گرتے شور مچایا اور بڑی زور سے ہائے ہائے بھی کی۔

لڑکی برآمدے میں آئی تو آگے دو آدمی کھڑے تھے۔ لڑکی نے مجھے جو بیان دیا اس کے الفاظ یہ تھے۔ "میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ ان دو آدمیوں سے مجھے ڈر نہ لگا۔ ایک نے ماچس جلا کر مقتول کو دیکھا اور دوسرے نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے انہیں بڑے اطمینان سے کہا کہ میں نے اسے چھری سے مار ڈالا ہے۔ ان آدمیوں نے بڑی اچھی باتیں کیں جن سے میرا دماغ ذرا اپنی جگہ آنے لگا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے پولیس کے حوالے کرو گے؟ ایک نے کہا کہ نہیں، ہمارے ساتھ آؤ ہم تمہیں باہر باہر سے گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں اُن کے ساتھ چل پڑی۔ مجھ پر کوئی نشہ سا طاری تھا۔ ایک سکون سا تھا جیسے میں نے بڑی لمبی بھاگ دوڑ کے بعد اپنا مقصد پا لیا ہو۔ مگر اچانک میرا دماغ روشن ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ یہ آدمی مجھے میرے گھر نہیں بلکہ کسی اور طرف لے جا رہے ہیں میں رُک گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں چھری نہیں تھی۔ میں نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زبردستی کی تو میں بیٹھ گئی۔۔۔۔

"پھر اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ کے کندھے پر اُٹھا لیا۔ میں اِس دیلے) کا مقابلہ کس طرح کر سکتی تھی۔ میں نے دل میں خدا کو پکارا اور خدا سے کہا کہ میں نے ایک بدمعاش کو ٹھکانے لگایا ہے۔ ایک گنہگار کو اس کے کیے کی سزا دی ہے۔ یا خدا! کیا تیرے پاس یہی انصاف ہے کہ غیرت مند لڑکی کو تو وحشیوں کے حوالے کر دے!۔۔۔۔ یہ مجھے یہاں لے آئے۔ مجھ پر غشی بھی طاری ہوئی۔ میں رو رو کر ہلکان بھی ہوتی رہی لیکن اس شخص کو جب میں نے سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ میرا کوئی بھائی نہیں تو اُس نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا، میں تیرا بھائی ہوں اور میں تیرا باپ ہوں۔"

"اس نے ٹھیک کہا تھا" میں نے لڑکی سے کہا۔ "خدا نے تمہاری دُعا سن لی تھی۔ جن

بہنوں کا کوئی بھائی نہیں ہوتا انہیں خدا بھائی دے دیا کرتا ہے۔ یہ رہزن بھی تمہارا بھائی ہے اور میں تھانیدار بھی تمہارا بھائی ہوں اب یوں کرنا کہ رات کو جب اپنے گھر پہنچو تو گھر والوں کو صرف یہ بتا دینا کہ میں دن کے وقت آ کر ساری بات بتاؤں گا۔ تم خود انہیں کوئی بات نہ بتانا۔ زبان کو قابو میں رکھنا۔"

خدا گواہ ہے کہ یہ لڑکی مجھے اس زمین کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ چوم لوں اور اس کے پاؤں میں بیٹھ کر اسے کہوں کہ میرے سر پہ ہاتھ پھیر دے۔ شاید تمہارے پاک ہاتھ سے اللہ میرے گناہ بخش دے۔

ہیڈ کانسٹیبل اتفاق سے مسلمان تھا۔ میں اس کا افسر تو تھا ہی لیکن وہ مجھے پیروں کی طرح مانتا تھا۔ میں نے اسے بلایا اور کہا۔ "میں بلّے کو گرفتار کر کے لے جا رہا ہوں۔ ساری نفری اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم یہیں رہ جانا۔ ہم جب دو چار سو گز دور نکل جائیں تو تم اس لڑکی کو ساتھ لے کے چل پڑنا۔ تم اسے تھانے میں نہیں لاؤ گے۔ اسے اس کے گھر چھوڑ آنا۔ اس کے والد صاحب کو کہنا کہ ملک صاحب کل خود آ کر ساری بات بتائیں گے.... اور تم یاد رکھو کہ لڑکی کو اس کے والدین کے حوالے کر کے بھول جانا کہ تم نے کیا کیا ہے۔ زبان پر ایک لفظ نہ آئے۔ رگھوناتھ کو میں سنبھال لوں گا۔ تمہیں سارا معاملہ کل سمجھاؤں گا۔"

میں نے بلّے کو ساتھ لیا۔ باہر آ کر ساری نفری سمیٹی اور روانہ ہو گئے۔ تھانے پہنچ کر بلّے کو حوالات میں بند کر دیا۔ کانسٹیبلوں کو چھٹی دے دی اور رگھوناتھ کو اپنے گھر لے گیا۔ اسے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس واردات میں ایک لڑکی ملوّث ہے اور لڑکی بلّے کے پاس ہے۔ اسے سب کچھ پتہ تھا۔ میں نے اسے ساری بات

بتادی۔ اور میں جو ڈرامہ کھیلنے والا تھا وہ اسے سمجھا دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا اور اسے کہا کہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ لڑکی میرے مذہب کی ہے۔ اگر وہ ہندو یا سکھ ہوتی تو بھی میں اسے بچانے کی اسی طرح کوشش کرتا اور اسی طرح خطرہ مول لیتا۔

میں نے رگھوناتھ سے کہا کہ دو باتوں پر غور کرو۔ ایک یہ کہ اس لڑکی نے ایک غنڈے اور بڑے ہی کمینے آدمی کو قتل کیا ہے اور اپنی بہن کی اور اپنی عزت کی خاطر قتل کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک ڈکیت نے اُسے اپنی بیٹی کہہ کر مجھے شرم دلائی اور اپنے آپ کو قتل کے الزام میں سزا بھگتنے کے لیے پیش کیا ہے۔ میں سارا کیس بچے پر بنا رہا ہوں۔ جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں وہ ضائع کر رہا ہوں۔ صرف چھری عدالت میں پیش کروں گا۔ کہو میری مدد کرو گے؟ تم پر بھروسہ کروں؟

مجھے رگھوناتھ کی ایک کمزوری کا علم تھا۔ وہ رشوت لیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ تفتیش کے لیے کسی کے گھر جائے تو وہاں اسے جو چیز اچھی لگے اُٹھا لاتا تھا۔ مجھے اس کی یہ کرتوت بالکل پسند نہیں تھی۔ اسی لیے وہ مجھ سے ڈرتا اور رہ کتا تھا۔ اب میں نے اسے بتا دیا کہ میں ایک غیر قانونی حرکت کر رہا ہوں تو اُس نے باچھیں کھلا کر کہا — "ضرور کرو ملک صاحب! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں بھی تو غیر قانونی حرکتیں کرتا رہتا ہوں۔ آپ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم جو جی میں آئے کرو، مجھے رشوت سے نہ روکنا، بس یہی میری شرط ہے۔ میں نے بھی اشارہ دے کر اس کی شرط قبول کر لی۔ میرا ضمیر صاف تھا۔ میں ڈیوٹی میں ضرور بد دیانتی کر رہا تھا لیکن خدا کی نگاہ میں مجرم نہیں تھا۔

وہ جوانی کی عمر تھی۔ خطرے مول لینے کے لیے طبیعت ذرا جلدی تیار ہو جایا کرتی تھی۔ یہ خطرہ تو ایسا تھا کہ میں نے اپنی نوکری بھی داؤ پر لگا دی۔ رگھوناتھ شراب کا شیدائی تھا۔ میں نے ایک ہندو کانسٹیبل کو بھیج کر اُس کے لیے دیسی شراب کی بوتل اور روسٹ مرغی منگوائی۔ دیسی شراب کے ٹھیکے رات بھر کھلے رہتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں میرے کام کی نہیں تھیں۔ شراب میں پیتا نہیں تھا اور مرغی جھٹکے کی تھی۔ مجھے رگھوناتھ کو قبضے میں لینا تھا۔

مفت کی بوتل اور مرغی دیکھ کر اُس نے قہقہہ لگایا اور بولا "ملک صاحب! جو کام کل کرنا ہے وہ ابھی کیوں نہ ہو جائے۔ لاؤ، مقدمہ قائم کریں"۔ میں اس سے یہی کہلوانا چاہتا تھا۔ یہ چھوٹا مقدمہ تھا جو میں اسی وقت مکمل کر لینا چاہتا تھا ورنہ رات بھر سو نہ سکتا۔ رگھوناتھ کے لیے گلاس آ گیا۔ میں نے بلّے کو بھی حوالات سے نکلوا کر پاس بٹھا لیا اور ایک گلاس اُس کے لیے بھی منگوا لیا۔ میں نے اسے کہا "بلّے! یہ مرغی جھٹکے کی ہے"۔ اُس نے کہا "ملک صاحب! ہم کون سے حلال کے ہیں"۔ اور وہ مرغی کھانے لگا۔

بلّا پرانا وارداتیا تھا۔ اگر میں کہوں کہ تفتیش، سراغ رسانی اور مقدمے کی کمزوریوں وغیرہ سے وہ مجھ سے زیادہ واقف تھا تو غلط نہیں ہو گا۔ اُس نے کہا "مقدمہ ایسا قائم کرو جس سے آپ لوگوں پر حرف نہ آئے کہ آپ نے مجھے صرف شک میں پکڑ لیا ہے اور تفتیش میں کوتاہی کی ہے۔ اسے رہزنی کی واردات لکھو"۔

یہاں سے میرے ذہن میں ایک لائن آ گئی۔ میں نے جائے واردات سے برآمد ہونے والی صرف یہ اشیاء رکھیں۔ چھری، چوڑیوں کے ٹکڑے اور سینڈل کا پاؤں جس کے متعلق لکھا کہ واردات کے کمرے سے برآمد ہوا ہے۔ مقتول کی جیب سے ایک سو چھتیس

روپے برآمد ہوئے تھے۔ گھڑی اور انگوٹھی بھی تھی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں شہادت سے نکال دیں اور تین نوٹ دس دس روپے کے، ایک پانچ روپے کا اور ایک روپے کے سات سکے شہادت میں اس طرح شامل کیے کہ یہ رقم خالی کمرے کے اندر بکھری ہوئی ملی ہے۔

سوچتے سوچتے میری نظر شراب کی بوتل پر پڑی جو رگھوناتھ اور بلّا پی رہے تھے۔ میں نے شراب کی بوتل اور تین گلاس شہادت میں شامل کر لیے۔ میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ خالی کوٹھی میں جوا چل رہا تھا اور شراب پی جا رہی تھی۔ اس پارٹی میں ایک عورت بھی تھی جس کی موجودگی چوڑیوں کے ٹکڑوں اور سینڈل کے ایک پاؤں سے ثابت کرتی تھی۔ مجھے خیال آ گیا کہ کوٹھی غیر آباد ہے اور وقت رات کا ہے۔ لہٰذا میں نے برآمد ہونے والی اشیا میں ایک ادھ جلی موم بتی شامل کر لی۔

## وہ رہزن تھا، میں پولیس انسپکٹر مگر ایک لڑکی کی خاطر....

غرض ہم کیس تیار کرتے رہے۔ رگھوناتھ نے نشے میں اور بلّے نے ہوش قائم رکھ کر نہایت اچھے مشورے دیئے اور جب ہمارا کیس مکمل ہو گیا تو صبح کے پونے چار بج چکے تھے۔ یہ تفصیلات چونکہ تیکنیکی ہیں اس لیے آپ کو سنانا بے معنی ہے۔ آپ بور ہوں گے۔ آپ کو مختصر سی بات سنا دیتا ہوں۔ میں نے قتل کا باعث جوا، عورت اور شراب رکھا۔ اسے تقویت دینے کے لیے میں نے دوسرے دن مقتول کی بیوی اور بیوی کے دونوں بھائیوں کو بلایا۔ یہ تینوں پہلے ہی مقتول سے نالاں تھے۔ میں نے انہیں پولیس والوں کی مخصوص اُستادی سے

جس میں ہمدردی اور اپنائیت کی جھلک ہوتی ہے، یہ ذہن نشین کرا دیا کہ مقتول جُوا کھیلتے اور ایک عورت کی وجہ سے قتل ہُوا ہے۔ پھر ان تینوں کے ذہن اپنے قبضے میں لے کر اس قسم کی شہادت دینے کے لیے تیار کر لیا کہ مقتول بدمعاش تھا۔ عورتوں کا شکاری تھا۔ جُوئے باز تھا۔ بیوی پر ظلم و تشدد کرتا تھا۔ میں نے انہیں بلّے کا چہرہ اچھی طرح دکھا کر کہا کہ عدالت میں یہ کہیں کہ اس شخص (بلّے) کو انہوں نے کئی بار مقتول کے ساتھ دیکھا تھا۔ پھر میں نے ایک پیشہ ور جھوٹا گواہ پکڑا جسے یہ بیان یاد کرایا کہ وقوعہ کی شام اُس نے مقتول کو بلّے کے ساتھ ایک تانگے میں شہر سے باہر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔

بلّے کی ہسٹری شیٹ تو مجھے عدالت میں پیش کرنی ہی تھی۔ اسے میں چھپا نہیں سکتا تھا۔ مقدمے کی اس بنیاد پر میں نے دونوں میں شہادت اور ثبوت کی عمارت کھڑی کر لی۔ یہ ساری شہادت CIRCUMSTANTIAL رکھی یعنی اس میں ٹھوس واقعات نہیں تھے اور نہ کوئی موقع کا گواہ۔ میں نے ان سوالوں کا جواب بھی مہیا کر لیا کہ بلّے کو میں نے کس طرح پکڑا اور اسی کو قاتل کیوں سمجھا۔ میں نے کیس ایسی خوبی سے تیار کیا کہ اوسط درجہ ذہن کا پولیس افسر بھی شک نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ کوئی تجربہ کار پولیس افسر یہ کیس پڑھتا تو میرے کان میں یہ ضرور کہتا ——"ملک صاحب! کتنے ہزار وصول کیے ہیں؟" —— بلّے کو سارا کیس بتا دیا جس کے مطابق اُسی نے صفائی کا بندوبست کر لیا۔

جس رات میں بلّے کو تھانے میں لایا، مجھے ہیڈ کانسٹیبل نے آکر بتایا کہ وہ لڑکی کو اُس کے گھر چھوڑ آیا ہے۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ پونے چار بجے کیس کا خاکہ بنا کر فارغ ہُوا۔ وردی اتاری۔ نہایا۔ اپنے کپڑے پہنے۔ اُس وقت سحر کا دُھندلکا ابھی صاف نہیں ہُوا تھا۔ میں لڑکی کے گھر چلا گیا۔ وہ سب ابھی سو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر گھر کے چاروں

فرد میرے گرد جمع ہوگئے۔ میں کیسے بتاؤں کہ وہ کس قدر ہراساں اور پریشان تھے۔ کسی کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی اور وہ مجھے اپنا محافظ سمجھ رہے تھے۔

میں نے لڑکی کے والدین کو اس کے سامنے سارا واقعہ سُنا دیا۔ انہیں تسلّی دی۔ حوصلہ بڑھایا اور انہیں سختی سے کہا کہ اس واقعہ کے متعلق زبانیں بند رکھیں۔ اُس وقت لڑکی کی ماں نے بتایا کہ اُن کے ہاں تین دن قرآن خوانی ہوتی رہی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ اب میرے لیے بھی دُعا کریں کیونکہ میں اپنی ساکھ اور اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ میں باپ کے تاثرات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسے تاثرات صرف دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ میں جب وہاں سے چلنے لگا تو لڑکی کی ماں نے مجھے گلے لگا لیا۔ بہت دیر گلے لگائے رکھا اور ہچکیاں لے لے کے روتی رہی۔ میں نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ لڑکی جس طرح پاک صاف گھر سے نکلی تھی اسی طرح پاک صاف واپس آئی ہے۔

تین چار روز بعد مقدمے کی کاغذی کارروائی سے فارغ ہو کر میں نے اس لڑکی کے بہنوئی کو اور بیگی کو لڑکی کے گھر آنے کو کہا اور مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ ان دونوں کو یہ نہیں بتایا کہ مقتول کو اس لڑکی نے قتل کیا ہے بلکہ یہ بتایا کہ وہ بدکار جُوا کھیلتے، شراب پیتے اور ایک عورت کو ساتھ لیے ہوئے ایک عادی مجرم کے ہاتھوں قتل ہُوا ہے۔ پھر بیگی اور اس لڑکی کی زبانی اس کا وہم دُور کیا۔ اس کی بیوی کو میں نے کہا کہ اسے اُس رقعے کے متعلق بھی بتاؤ۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ تم مقتول کے گھر اور اس کی دکان پر کیوں گئی تھیں۔ اُس نے بتا دیا اور اس کا وہم دُور ہو گیا۔ میں نے اس پر تھانیداری کا رعب بھی جھاڑ دیا تاکہ اُس کا دماغ درست رہے اور اسے شرم بھی دلائی کہ اس کا فرض یہ تھا کہ ایسی نیک بیوی اور ایسے بھلے مانس سسرال کی عزت کا تحفظ کرتا۔ بہر حال وہ نادم ہو کر اپنی بیوی کو لے گیا۔

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کی گمشدگی اور آٹھ دنوں کی غیر حاضری کا محلے میں کوئی چرچا نہیں ہوا۔ گھر والوں نے بڑی خوبی سے پردہ ڈالے رکھا تھا۔ لہٰذا اُس کا رشتہ جو طے ہو چکا تھا وہ محفوظ رہا۔

اب میرا امتحان باقی تھا۔ کیس کورٹ میں جا رہا تھا۔ مَیں نے چالان پیش کر دیا۔ حوالات میں بِلّے کی میں نے خوب خاطر تواضع کی۔ بِلّے نے کورٹ میں جرم سے انکار کر دیا۔ پھر مقدمہ چلا۔ گواہ بھگتے۔ شہادتیں پیش ہوئیں۔ بِلّے کی ہسٹری شیٹ پیش ہوئی۔ دن گزرتے رہے اور آخر کیس سیشن سپرد ہو گیا۔ سیشن جج ایک انگریز تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگریز غیر معمولی طور پر قابل ہوتے تھے۔ ان کی قابلیت یہ تھی کہ بادشاہ تھے۔ سیاہ اور سفید کے مالک تھے۔ البتہ ان میں خوبی یہ تھی کہ اپنے فرائض کے معاملے میں دیانت دار اور محنتی تھے۔ ہمارے افسروں کی طرح افسری کا ناجائز استعمال نہیں کرتے تھے۔ لیکن کبھی آپ کو ایک ایسے انگریز پولیس افسر کی کہانی سناؤں گا جس نے دو ہزار روپے رشوت قبول کر کے اور کیس میں ملوث ایک دیہاتی نوجوان لڑکی کو دو تین روز اپنے پاس رکھ کر میرا ایک کیس چوپٹ کر دیا تھا۔

بِلّے کا کیس انگریز سیشن جج کے پاس گیا۔ بِلّے کا وکیل کچھ تیز تھا اور کچھ میرا استغاثہ کمزور تھا جس سے وہ نہایت قابلیت سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ (یہ یاد رہے کہ بِلّا اب جیل میں حوالاتی تھا۔ مَیں اس کے لیے پھل فروٹ اور ضرورت کی دیگر اشیاء کسی کے ہاتھ جیل میں بھیجتا رہتا تھا)۔

اس انگریز سیشن جج نے بِلّے کی ہسٹری شیٹ کو سامنے رکھا اور اسی بنا پر اسے چودہ سال سزائے قید بامشقت سنا دی۔ اُس نے جو فیصلہ لکھا وہ بہت کمزور تھا۔ مجھے یہ فیصلہ دیکھتے ہی یقین ہو گیا تھا کہ بِلّا اپیل میں بری ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ ہائی کورٹ

میں اپیل دائر ہوئی تو دوسری ہی پیشی میں منظور ہو گئی۔ بلّے کو ہائی کورٹ نے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ اُسی شام جیل سے رہا ہو کر بِلّا مجھے ملنے آیا۔ میں نے اسے ایک جگہ بتا کر کہا کہ شام کے بعد وہاں میرا انتظار کرنا، میں تمہیں اس لڑکی کے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔

یقین کیجئے، بِلّے نے کہا ——"نہ ملک صاحب! میں ناپاک آدمی ہوں۔ اُس گھر میں میرا سایہ نہ لے جاؤ"—— اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔

میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ رہزن تھا۔ ڈکیت تھا۔ بردہ فروش تھا۔ یہی اس کی ہسٹری شیٹ میں لکھا تھا مگر اس کے سینے کی تحریر کچھ اور تھی۔ وہ صرف میں نے اور رگھوناتھ نے پڑھی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا اور جب وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

# بھگوان کے بعد تم ہو

نقب زنی کی ایک واردات جسے کانگرسی لیڈروں نے سیاسی مسئلہ بنادیا —— ہندو لڑکی نے اپنے کانگرسی باپ کو ایک مسلمان لڑکی کی خاطر عدالت میں بے نقاب کر دیا۔

نقب زنی کی یہ واردات اور میری تفتیش کی یہ روئیداد اُن حضرات کے لیے شاید عجیب و غریب ڈرامہ ہو جو پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں لیکن اُن حضرات کے لیے جو ملک کی تقسیم یعنی اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوؤں کے ساتھ رہے ہیں، یہ ڈرامہ حیران کُن نہیں ہوگا۔ ہندوؤں کی ذہنیت کو جاننے والے اچھی طرح بتا سکتے ہیں کہ ۱۹۴۴ء کے بعد جب مطالبۂ پاکستان مشہور ہو چکا تھا، ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہر سطح پر اور ہر شعبے میں نقصان پہنچانے کے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کیے تھے۔ ایک غریب سے مسلمان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کانگرس کے لیڈر اسے سیاسی مسئلہ بنا کر ایک محاذ پر متحد ہو جاتے تھے۔

اسی دَور میں ہندوستان کے ایک شہر میں ایک امیر کبیر ہندو تاجر کے گھر نقب لگی۔ میں حسبِ معمول اس شہر کا نام اور کرداروں کے اصلی نام استعمال نہیں کروں گا کیونکہ اس کا مرکزی کردار جو مسلمان تھا وہ پاکستان میں ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے بیٹوں نے یہاں محنت اور دیانت داری سے باعزت معاشرتی حیثیت حاصل کر لی ہے جس کی مجھے دلی خوشی ہے.... سورج طلوع ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ مجھے ایک ہندو کانسٹیبل

نے جگایا اور بتایا کہ نقب زنی کی ایک رپورٹ آئی ہے۔

میں دفتر میں گیا۔ رپورٹ دینے والا ایک ہندو ونیٹھ تھا۔ شہر کے بڑے بڑے سیٹھوں، سیاسی اور مذہبی لیڈروں، جرائم پیشہ افراد اور دیگر غنڈوں وغیرہ سے پوری طرح آگاہ ہونا ایس۔ ایچ۔ او یعنی تھانے کے انسپکٹر انچارج کے لیے بیحد ضروری ہوتا ہے۔ میں ابھی ان لوگوں سے واقف نہیں ہوا تھا کیونکہ اس شہر میں آئے اور تھانے کا چارج لیے ابھی بارہ روز ہی ہوئے تھے۔ کانسٹیبل نے مجھے گھر میں ہی بتا دیا تھا کہ یہ ہندو سیٹھ شہر کے چند ایک بہت امیر تاجروں میں سے ہے اور اثر و رسوخ والا بھی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے ساتھ ذرا سنبھل کر اور محتاط ہو کر بات کی جائے اور اسے ٹرخانے کی کوشش نہ کی جائے جیسا کہ بعض تھانیدار کیا کرتے تھے۔

نقب زنی کے متعلق تھوڑی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ نقب کا آجکل رواج نہیں رہا۔ اب تو دن دہاڑے تالے ٹوٹتے ہیں۔ راتوں کو چور اچکے دیواریں پھاند کر اندر چلے جاتے ہیں اور جو ہاتھ لگے اٹھا لے جاتے ہیں۔ پستول دکھا کر بنک لوٹ لیے جاتے ہیں اور ایسی دلیرانہ وارداتیں ہوتی ہیں جیسے اس ملک میں نہ پولیس ہے نہ قانون۔ ان دلیرانہ وارداتوں سے یہ مطلب لینا غلط ہے کہ ہمارے جرائم پیشہ لوگ دلیر اور جانباز ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قانون کے محافظ ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ان میں بعض سیاسی پارٹیوں کے پالے ہوئے بدمعاش ہوتے ہیں جنہیں سیاسی میدان میں مخالفین کے جلوسوں، جلسوں میں ہنگامہ کرنے اور مخالفین کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جب کوئی سیاسی پارٹی اقتدار میں آجاتی ہے تو اس کے غنڈے من مانی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور انہیں یہ حق دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان جرائم پیشہ لوگوں کی پشت پناہی پولیس بھی کرتی ہے لیکن یہ نہ سمجھ لیں کہ پاکستان

جیسے سیاسی اور سرکاری نظام میں جہاں کسی وارداتیے کی گرفتاری کے ساتھ ہی اوپر سے ایک ٹیلیفون آجائے کہ "ملک صاحب خیال رکھنا۔ یہ اپنا آدمی ہے"۔ وہاں پولیس آفیسر قانون اور تحفظِ عامہ کی بجائے اپنی نوکری اور ترقی کا زیادہ فکر کرتے ہیں۔

جہاں قانون شکنی کی اتنی پشت پناہی حاصل ہو جائے وہاں کسی کو نقب لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انگریزوں کی حکومت میں ایسی کھلی چھٹی نہ جرائم پیشہ لوگوں کو تھی نہ پولیس کو۔ ہیرا پھیری پھر بھی ہوتی تھی۔ رشوت بھی لی دی جاتی تھی لیکن یہ حال نہیں تھا کہ سارا نظام ہی ہیرا پھیری اور رشوت پر چل رہا ہو اور لوگ قانون کو ہی خرید لیں۔ میں نے چوروں کے ساتھ تھانیداروں کو بھی دس دس سال کے لیے قید ہوتے دیکھا ہے۔

اُس وقت واردات اس طرح کی جاتی تھی کہ سراغ اور کھرا نہ ملے۔ پولیس قسم کھا کے نکلتی تھی کہ سراغ لگا کے دم لیں گے۔ ایسی صورتِ حال میں نقب زنی ڈاکے کا ذریعہ تھی۔ ڈاکو کسی مکان کے پچھواڑے کی دیوار صرف اتنی سی پھاڑا کرتے تھے جہاں سے ایک آدمی پیٹ کے بل رینگ کر اندر جا سکے اور جہاں سے عام سائز کا ٹرنک باہر نکالا جا سکے۔ نقب زنی کی وارداتیں گرمیوں میں ہوتی تھیں جب لوگ چھتوں پر یا صحن میں سوتے تھے۔ اس کے لیے زیادہ موزوں مہینے مارچ، اپریل اور اکتوبر کے ہوتے تھے کیونکہ اس موسم میں لوگ چھتوں کی بجائے صحن میں سوتے تھے۔

پچھلی دیوار کی اینٹیں ایک آہنی سلاخ سے جسے سُمبا کہتے ہیں ایسی استادی سے نکالی جاتی تھیں کہ گھر والوں کو ذرا سی بھی آہٹ نہیں سنائی دیتی تھی۔ بے حد مضبوط دیواروں میں سے اینٹیں نکال لی جاتی تھیں۔ پھر مجرم اندر جا کر ٹرنک اور سوٹ کیس باہر لا کر غائب ہو جاتے تھے۔ نقب زنی استادوں کا ایک فن تھا۔ ہر کوئی نقب نہیں لگا سکتا تھا۔ نقب

لگی دیکھ کر خوف طاری ہو جاتا تھا جیسے یہ انسانوں کی نہیں جنّوں کی کارستانی ہو۔ نقب ہمیشہ مکان کے پچھواڑے کی دیوار میں لگائی جاتی تھی۔ وہ مکان جن کے پچھواڑے کھلا میدان یا کھیت ہو، نقب کے لیے زیادہ موزوں تھے۔

اس ہندو سیٹھ کا مکان ایسا ہی تھا۔ مکان کیا تھا ایک محل تھا۔ پرانے زمانے کی حویلی تھی۔ پچھواڑے میں میدان تھا جس میں لڑکے ہاکی اور والی بال کھیلا کرتے تھے۔ ایک اکھاڑہ بھی تھا۔ جہاں میدان ختم ہوتا تھا وہاں بارش کے پانی کا قدرتی تالاب تھا۔ اس سے آگے سڑک تھی اور یہ سارا علاقہ شہر کا ایک سرا تھا یعنی اس سے آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔

میں ضرورت کے مطابق اپنا سٹاف ساتھ لے کر ہندو سیٹھ کے ساتھ موقعۂ واردات پر پہنچا۔ اس سیٹھ کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ اُس قسم کا روایتی بنیا نہیں تھا جو دھوتی اور لمبا کرتہ پہنا کرتے تھے اور ان کے سر پر بودی ہوتی تھی اور جن کا پیٹ بڑھا ہوا ہوتا تھا۔ یہ ماڈرن قسم کا سیٹھ تھا۔ آڑھت کی منڈی کا کرتا دھرتا تھا۔ ساہوکارہ بھی کرتا تھا۔ تعلیم یافتہ تھا اور سیاسی میدان کا بھی کھلاڑی تھا۔ اگر وہ روایتی بنیا سیٹھ ہوتا تو تھر تھر کانپ رہا ہوتا لیکن یہ ہندو پورے ہوش میں تھا۔ اس کے رپورٹ دینے اور باتیں کرنے کے انداز میں حکم کا رنگ تھا۔ دو ایک بار میں نے یہ بھی محسوس کیا جیسے وہ مجھے اپنا نوکر سمجھتا ہے۔

میں اُس کے مکان کے پچھواڑے پہنچا تو صبح کی روشنی سفید ہو چکی تھی اور تماشائی میرے لیے یہ مشکل پیدا کر چکے تھے کہ انہوں نے نقب زنوں کے کھُرے اپنے پاؤں تلے مسل ڈالے تھے۔ بہت سی اشیاء دیوار سے سڑک تک بکھری ہوئی تھیں لہذا تماشائی بھی دیوار سے سڑک تک (فاصلہ ساڑھے چار سو گز) یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے نمائش کے مختلف سٹال

دیکھ رہے ہوں۔ میرے کانسٹیبلوں نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا لیکن بیکار تھا۔ کھرے ختم ہو چکے تھے۔

## بھگوان کی آنکھ لگ گئی تھی

میں نے نقب کو غور سے دیکھا۔ یہ کسی اُستاد کا کام تھا۔ اینٹیں اُستادی طریقے سے نکالی گئی تھیں۔ نقب زمین کے ساتھ لگی تھی۔ سوراخ پونے تین فٹ اور اڑھائی فٹ تھا۔ اس کے قریب جو کھرے تھے وہ گڈمڈ تھے کیونکہ مجرموں نے وہاں بیٹھ کر دیوار توڑی تھی اور پھر اس جگہ سے تماشائیوں نے کھرے مٹا دیئے تھے۔ میں نے اپنی عادت اور اپنے طریقۂ کار کے مطابق دیوار کے سوراخ کو اور زمین کو بہت ہی غور سے دیکھا۔ میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں سنایا ہے کہ موقعۂ واردات کو اگر تھانیدار گہری نظر سے دیکھے اور گھاس کے ٹوٹے ہوئے تنکے کو بھی نظر انداز نہ کرے تو کوئی نہ کوئی سراغ اسے مل ہی جاتا ہے خواہ وہ کسی انسان کا دو سوتر لمبا بال ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اس کے لیے گہری نظر اور تیز دماغ کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ مٹی پتھر اور اینٹیں بولا نہیں کرتیں، ان کی خاموش زبان کو سمجھنا پڑتا ہے۔

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے زمین پر ایک چیز نظر آگئی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ سونگھا۔ پھر پھٹی ہوئی دیوار میں جمایا۔ یہ چیز ایک جگہ فٹ آگئی۔ میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو یہ چیز دے کر کہا "فوراً تھانے جاؤ۔ اس کا پارسل بناؤ اور ڈاک کے ذریعے نہیں بلکہ کسی کانسٹیبل کے ہاتھ کیمیکل اگزامینر کو بھیج دو۔" ایک پسنجر ٹرین سوا دس بجے گزرتی تھی۔ میں نے اے ایس آئی کو مکمل ہدایات دے دیں کہ وہ اس کے ساتھ چٹھی میں کیا لکھے اور اسے کہا کہ کانسٹیبل کو سوا دس بجے کی گاڑی سے بھیج دو۔ اسے چالیس میل دور جانا تھا۔

میں نے اندر جا کر دیکھا۔ جس کمرے کی دیوار میں نقب لگائی گئی تھی، اس کے دائیں، بائیں اور آگے تین کمرے تھے، نقب والا کمرہ عبادت گاہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک چبوترہ سا تھا۔ اس پر بھگوان اور اس کی دو دیویوں کی مورتیاں تھیں۔ ان کے گلے میں مصنوعی ہار پڑے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے قالین بچھا ہوا تھا۔ دو دیواروں کے ساتھ صوفوں کی طرح بید کی لمبی اور چھوٹی کرسیاں تھیں۔ دیواروں کے ساتھ مذہبی تصویریں آویزاں تھیں۔ نقب بھگوان کے دائیں پہلو کے ساتھ لگائی گئی تھی۔ اس وقت شاید بھگوان کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔

دائیں طرف والے کمرے میں ٹرنک، پیٹیاں اور سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ اسی کمرے میں سے سامان چوری ہوا تھا۔ دو ٹرنک اور ایک اٹیچی کیس غائب تھے۔ ایک ٹرنک دو ٹرنکوں کے نیچے سے نکالا گیا۔ اوپر والے دونوں ٹرنکوں کو نقب زن الگ رکھ گئے تھے۔ تین اٹیچی کیس تھے جن میں سے صرف ایک اٹھایا گیا تھا۔ دونوں ٹرنک اور اٹیچی کیس خالی تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کسی گھر کے بھیدی کا کام ہے۔ اس نے وہی ٹرنک اٹھوائے تھے جن میں نقدی، زیورات اور قیمتی کپڑے تھے۔ کرنسی کی شکل میں نقدی چھتیس ہزار تھی اور زیورات تیس ہزار کی مالیت کے تھے۔ کپڑے ریشمی تھے۔ باقی کمروں میں کسی چیز کو بالکل نہیں چھیڑا گیا تھا۔

باہر کا منظر یہ تھا کہ مکان کے پچھواڑے سے پچاس گز دور ایک ٹرنک کھلا پڑا تھا۔ اس کا تالا بہت مضبوط تھا لیکن بڑی صفائی سے توڑا گیا تھا۔ کچھ کپڑے اس کے اندر رکھے ہوئے تھے اور کچھ باہر بکھرے ہوئے تھے۔ دوسرا ٹرنک میدان کے کنارے پر، تالاب کے قریب پڑا تھا۔ اس کا تالا زیادہ مضبوط اور پیچیدہ تھا۔ لہٰذا ڈھکنے کے پیچھے والی سلاخ نکال کر

اسے کھولا گیا تھا۔ اس میں بھی کچھ کپڑے پڑے تھے اور کچھ باہر بکھرے ہوئے تھے۔ چار گز دور سونے کے ہار کا خالی ڈبہ پڑا تھا۔ اتنا ہی آگے سونے کے کڑوں کی بڑی خوبصورت خالی ڈبیا پڑی تھی۔ سات گز آگے زیور کا ایک اور ڈبہ اور اسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زیورات کے خالی ڈبے ڈبیاں بکھری ہوئی تھیں۔ چند اور اشیا۔ اور عام سے کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور اٹیچی کیس غائب تھا۔ ہندو سیٹھ نے بتایا کہ اٹیچی کیس چمڑے کا تھا اور سائز بڑا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ٹرنکوں میں سے قیمتی اشیا نکال کر اٹیچی کیس میں ڈالی گئی ہیں۔

میں نے یہ اشیا سرسری نظر سے دیکھیں۔ اب میں دیوار سے سڑک تک بکھری ہوئی چیزوں اور کپڑوں کو غور سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کوئی اور ہو۔ ہندو سیٹھ کو بھی میں وہاں سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گھر جا کر ان زیورات اور ریشمی کپڑوں کی فہرست بنائے جو چوری ہوئے ہیں اور بیوی سے پوچھ کر یہ بھی لکھے کہ کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن کیا تھے۔ اسے بھیج کر میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ تماشائیوں کو دور بھگا دیں۔ بعض اوقات مجرم بھی تماشائیوں میں موجود ہوتے ہیں اور بڑی غور سے دیکھتے رہتے ہیں کہ تفتیش کس لائن پر اور کس رُخ کو ہو رہی ہے۔ اس سے وہ یہ فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیتے ہیں۔

لوگوں کو دور ہٹا کر میں نے بکھری ہوئی اشیا کو اچھی طرح دیکھا۔ پھر ایک ٹرنک کے پاس بیٹھ کر اس میں رکھے ہوئے کپڑوں کو کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ ٹرنک کے قریب کشیدہ کاری کی ایک کتاب پڑی تھی۔ اس پر نام لکھا تھا ــــ "کملا"۔ اس کے چند ایک ورق اُلٹے تو دو تصویریں برآمد ہوئیں۔ ایک ہندو سیٹھ کی فیملی فوٹو اور ایک پاسپورٹ

سائز کی فوٹو الگ تھی۔ یہ ایک جوان آدمی کی فوٹو تھی۔ میں نے دونوں تصویریں جیب میں ڈال لیں۔ پھر میں نے دونوں ٹرنکوں کو اچھی طرح دیکھا۔ اس دوران میرا ذہن خود کار مشین کی طرح سوچتا رہا کہ یہ واردات کس کی ہو سکتی ہے۔

ذہن بار بار ان نامی گرامی ڈاکوؤں کی طرف جاتا تھا جو جنگلوں اور بیابانوں میں سے گزرنے والی شاہراہوں پر بڑے پیمانے کی رہزنی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ گروہوں کی صورت میں قصبوں اور دیہات میں ڈاکے ڈالا کرتے تھے۔ یہ ڈاکو نقب کم ہی لگایا کرتے تھے۔ وہ دلیر لوگ تھے۔ پولیس کا باقاعدہ مقابلہ کرتے تھے۔ انگریز بھی ان کے ہاتھوں پریشان ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں ایسے ڈاکو بھی تھے جو چیلنج کر کے آیا کرتے تھے۔ میرے تھانے کے علاقے میں ایسے دو اشتہاری ڈاکو تھے۔ ان میں پربت نام کا ڈاکو زیادہ خطرناک تھا۔ وہ قتل کی گیارہ، ڈاکے کی سترہ، راہزنی کی بارہ اور اغوا کی پانچ وارداتوں میں مطلوب تھا۔

دوسرا ڈاکو نرسنگھ مونا تھا۔ یہ داڑھی اور سر کے بالوں کے بغیر سکھ تھا اس لیے اسے مونا کہتے تھے۔ وہ بھی قتل، ڈکیتی، رہزنی، اغوا اور گرفتاری سے بچنے کی مسلح کوشش کی بہت سی وارداتوں میں مطلوب تھا۔ پربت اور نرسنگھ مونا کے طریقہ واردات میں نقب زنی شامل نہیں تھی۔ نقب زنی میں مجرموں کے مخبر یا گھر کے بھیدی کا وجود ضروری ہوتا ہے۔ اس ہندو سیٹھ کا بھی کوئی گھر بھیدی تھا جو اس کا اپنا نوکر ہی ہو سکتا تھا۔ اسے پکڑ کر وعدہ معاف گواہ بنانے سے میری تفتیش ختم ہو سکتی تھی۔

میں نے سڑک سے آگے کھرا اٹھانے کے لیے دو ماہر کھوجی بھیجے اور اپنے دیہاتی مخبروں کو بھی اس علاقے میں پھیلا دیا جہاں پربت اور مونے کے آدمیوں کی موجودگی کا شک تھا۔ چوتھے روز میرے ایک مخبر نے مجھے یہ اطلاع دی کہ نرسنگھ مونے کے ایک

مخبر نے اسے کہا ہے کہ یہ واردات ان کی دمونے کے گروہ کی، نہیں ہے اس لیے ہمارے کھرے ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہ کرو موتے نے بھی کہا تھا ـــ "میں جب تمہارے شہر آؤں گا بتا کر آؤں گا" ـــ میرے مخبر نے موتے کے مخبر سے پربت کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا۔ اس نے جواب دیا تھا ـــ "تمہارے داروغہ کا دماغ خراب ہے۔ اسے کہو کوئی اور نوکری کرے۔ پربت چوروں کی طرح نقب نہیں لگایا کرتا۔"

# قمیضیں اُتروا دیں

مجھے یقین آگیا۔ یہ پیشہ ور ڈاکو اپنے آپ کو جرائم پیشہ نہیں بلکہ اپنے اپنے علاقے کا بادشاہ سمجھا کرتے تھے۔ ان کا ایک کردار تھا۔ بات تول کر کرتے اور جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ میں نے اُدھر سے توجہ ہٹالی۔ یہاں یہ ذہن میں رکھیے کہ قتل کوئی بھی آدمی کر سکتا ہے، ایسے انسان بھی قتل کر ڈالتے ہیں جنہوں نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری۔ یہ فوری اشتعال اور جذبہ انتقام سے مغلوب ہو جانے کا نتیجہ ہوتا ہے مگر ڈاکہ اور نقب زنی صرف پیشہ وروں کا کام ہوتا ہے۔

ان چار دنوں میں یعنی موتے کا پیغام آنے سے پہلے میں نے شہر میں اپنی تفتیش جاری رکھی۔ ہندو سیٹھ سے گمشدہ اشیاء کی مطلوبہ تفصیلات لے لیں۔ واردات سے اگلی رات کانسٹیبل جسے میں نے ایگزامینر کے پاس بھیجا تھا، رپورٹ لے کر آگیا۔ میں نے پارسل سنبھال لیا اور اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ تمام سزا یافتہ اور دیگر رجسٹر ڈ بدمعاشوں اور مشتبہ افراد کو اکٹھا کر کے لے آؤ اور دیکھو کہ ان میں کون نہیں ہے اور وہ کہاں ہے۔ اسی دوران سیٹھ

سے نوکروں کی فہرست مانگی۔ اس نے بتایا کہ دکان میں ایک منشی اور چار نوکر ہیں اور ایک نوکر گھر میں ہے۔

"آپ کے گھر کے افراد کتنے ہیں؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "ان کی عمریں کیا ہیں؟"

"بیوی ہے" ــــ اس نے بتایا ــــ "ایک بیٹا، عمر تیرہ سال۔ دوسرا بیٹا، عمر نو سال اور ایک بیٹی، عمر ساڑھے چھ سال۔"

اس کا یہ جواب سن کر میں اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میری نظروں سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا اور جب اس نے میری طرف دیکھا تو میں ابھی تک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا جیسے وہ گھر کے کسی فرد کو چھپا رہا تھا یا ہو سکتا ہے کہ یہ میرا شک ہی ہو۔

میں نے اُسے دھیمی سی آواز میں کہا ــــ "آپ نے گھر کے تمام افراد مجھے بتا دیئے ہیں؟"

"تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے؟" ــــ آدمی ہوشیار اور بارعب تھا۔ کہنے لگا ــــ "کیا آپ کو یہ شک ہے کہ میرے گھر میں میری اولاد نے ڈاکہ ڈالا ہے؟"

"ابھی میں آپ سے بیسیوں ایسی باتیں پوچھوں گا جن سے آپ سٹپٹا جائیں گے" ــــ میں نے اسے تحمل سے کہا ــــ "مجھے اس واردات کی تفتیش کرنی ہے جو آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ مجھے تو ابھی یہ بھی دیکھنا ہے کہ آپ نے زیورات کی انشورنس تو نہیں کرائی؟ اور کیا انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے یہ نقب زنی آپ کا اپنا ہی ڈرامہ تو نہیں؟"

"ذرا تمیز سے بات کرو انسپکٹر!" ــــ اس نے حاکموں کی طرح مجھے ڈانٹ دیا ــــ

"تم نئے ہو، مجھے جانتے نہیں۔ میں گورنر تک پہنچنے والا آدمی ہوں۔"

میں ہنس پڑا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا — "میرے لیے یہ کوئی مشکل نہیں کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ البتہ آپ کو یہ مشکل پیش آئے گی کہ آپ مجھے نہیں جانتے۔"

میں یکلخت کرسی سے اٹھا اور لہجے میں سنجیدگی پیدا کر کے کہا — "آپ تشریف لے جا سکتے ہیں ..... اور اپنے رویے میں صبر اور تحمل پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو زیورات کی ایک ایک آئٹم اور گمشدہ رقم کی پائی پائی واپس دلاؤں گا۔ میں گورنر تک پہنچنے والا آدمی نہیں ہوں معمولی سا داروغہ ہوں لیکن آپ کا یہ وہم دور کر دینا چاہتا ہوں کہ گورنر اپنے قانون کے تحفظ کے لیے آپ کے ساتھ نہیں، صرف میرے ساتھ تعاون کرے گا۔"

وہ چلا گیا اور میں نے اس کے متعلق یہ رائے قائم کر لی کہ آدمی اچھے چال چلن کا نہیں۔ استاد ہے اور کھلاڑی ہے۔ عام ہندوؤں سے بہت مختلف ہے۔ میں چوکنا ہو گیا۔

شام کے بعد شہر کے جرائم پیشہ اور مشتبہ افراد تھانے پہنچنے لگے۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ سارے شہر میں وہ کُل بیالیس تھے جن میں سولہ سزا یافتہ تھے۔ کانسٹیبل انہیں لا رہے تھے۔ رات دس بجے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ آخری آدمی بھی آ گیا ہے۔ ان میں سے چھ نہیں تھے۔ کہیں باہر چلے گئے تھے یا روپوش ہو گئے تھے۔ میں نے سب کو دو قطاروں میں کھڑا کر کے کہا — "قمیضیں اتار دو۔"

سب نے قمیضیں اتار دیں۔ مجھے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ اگلی قطار میں سے ساتویں آدمی کو میں نے بازو سے پکڑ کر قطار سے الگ کر دیا اور اے۔ ایس۔ آئی سے کہا۔ "اسے بند کر دو۔" اسے اسی وقت حوالات میں بند کر دیا گیا۔

میرا کام بن گیا۔ میں نے نقب زنی کے ایک ملزم کو پکڑ لیا تھا۔ دوسروں سے صرف

اتنا کہا۔ "میں تم سب کو سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ جاؤ اور سوچو۔ اس واردات کا جو ملزم خاموشی سے میرے پاس آجائے گا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُسے معافی دلا کر سُلطانی گواہ بنا لوں گا۔۔۔جاؤ"۔ وہ سب چلے گئے۔

میں نے جسے بند کیا تھا اس کے متعلق اپنے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ کل اس ملزم کو سول سرجن کے پاس لے جائے اور اس کے خون کا گروپ اور خون کے متعلق دیگر معلومات کی مکمل رپورٹ لے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے بتایا کہ اس شہر میں خون کے اتنے گہرے اور تفصیلی معائنے کا انتظام قابلِ اعتماد نہیں۔ اسے وہیں لے جانا پڑے گا جہاں پارسل والی چیز کا معائنہ کرایا تھا۔ میں نیا تھا۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ اس شہر میں جو دراصل بڑا قصبہ اور بہت بڑی منڈی تھی، کیا کیا انتظام ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ میں نے اسے سرکاری چٹھی متعلقہ ایکسپرٹ کے نام لکھ دی اور ایک چٹھی وہاں کے پولیس ہیڈکوارٹر کے نام لکھی کہ اگر ملزم کو وہاں رات بھر کے لیے رکنا پڑے تو اسے کسی تھانے کی حوالات میں بند کرنے کا انتظام کیا جائے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے جائے اور ملزم کو ہتھکڑی میں لے جائے۔

اگلی صبح میں ہندو سیٹھ کی دکان پر چلا گیا۔ آڑھت کی بہت بڑی دکان تھی۔ سیٹھ باہر کھڑا تھا۔ رسمی طور پر مجھے ملا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ منشی کب سے آپ کے پاس ہے؟"

"بہت عرصے سے ہے"۔

"ایک سال، دو سال، چار سال۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے یاد نہیں"۔۔۔ اس نے مجھے ٹوک کر جواب دیا اور بولا ۔۔۔ "یہ بہت شریف آدمی ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میرے گھر کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں

ہے۔ میں اس پر ایسا شک نہیں کر سکتا کہ یہ گھر کا بھیدی ہوگا"۔۔۔ ذرا سی خاموشی کے بعد اس نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا۔۔۔ "یہ ہندو ہے مسلمان نہیں"۔۔۔ یہ چوٹ میں نے برداشت کر لی۔

منشی مجھے دکان کے دوسرے حصے میں تخت پر بیٹھا نظر آرہا تھا۔ میں اس کی طرف چلا تو سیٹھ بھی ساتھ چل پڑا۔ میں رُک گیا اور اسے کہا کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ اس نے پہلے تو ذرا دبدبے سے بات کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "آپ میری ایجنسی میں آئے ہیں۔ میرا ساتھ رہنا ضروری ہے"۔۔۔ میں نے جب اکیلا رہنے پر اصرار کیا تو اس نے یکلخت اپنا رویّہ بدل لیا۔ اپنے ایک ملازم کو اس نے بڑی تیزی سے دس کا نوٹ دیا اور اسے کہا۔ "بھاگ کر لیمن سوڈے کی ایک بوتل لاؤ اور کچھ پھل فروٹ بھی لے آؤ۔"

اس نے مجھے ذرا پرے رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا لیا اور دوستانہ لہجے میں بولا "میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ میری ایجنسی میں آئے اور میں نے آپ سے پانی بھی نہیں پوچھا"۔ اس نے اپنے نقصان کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے کہا کہ آپ اپنے جس ملازم کو شریف سمجھتے ہیں، ہوسکتا ہے وہ میری نظر میں مشتبہ ہو۔ گھر بھیدی عموماً منشی ہوا کرتے ہیں۔ میں اُٹھا اور منشی کے پاس چلا گیا۔ اس سے صرف یہ سوال پوچھا۔۔۔ "تم یہاں کب سے ہو؟"

"ابھی ڈیڑھ مہینہ بھی نہیں ہوا"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

"پہلے کون تھا؟"

"ایک مسلمان منشی تھا"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

اتنے میں سیٹھ بھی میری طرف آیا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے وہیں

روک دیا اور منشی سے پوچھا۔" وہ کتنا عرصہ یہاں رہا اور وہ کیوں اور کہاں چلا گیا ہے"؟

"وہ بہت عرصے سے یہاں ملازم تھا"۔۔۔ منشی نے جواب دیا۔۔۔ "سیٹھ نے اسے نکال دیا ہے"۔

"کیوں؟"

"یہ تو سیٹھ صاحب ہی بتا سکتے ہیں"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی"۔

"تم سیٹھ کے گھر جایا کرتے ہو؟"

"نہیں جی"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "ابھی تک نہیں گیا"۔

"پہلا منشی شاید جاتا ہوگا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہیں تو معلوم نہیں ہوگا"۔

"ان لوگوں (مزدوروں) نے بتایا تھا کہ وہ سیٹھ کے گھر جایا کرتا تھا"۔

## بہن لاپتہ ہوگئی

اتنے میں لیمن کی بوتل آگئی۔ میں نے پی لی اور سیٹھ سے کہا۔" میں آپ کے منشی اور چاروں نوکروں کو ساتھ لے جا رہا ہوں"۔

اس نے کہا کہ اس کا کام رک جائے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری تفتیش نہیں رک سکتی۔ اس کے کام رکتے ہیں تو رکے رہیں۔۔۔۔ میں نے اس کی دلیل بازی کو نظر انداز کرتے ہوئے منشی اور چاروں نوکروں کو بلایا اور کانسٹیبل سے کہا کہ انہیں تھانے لے چلو۔

مجھے ایک شک تو یہ تھا کہ گھر بھیدی ان نوکروں میں ہی نہ ہو اور دوسرا شک سیٹھ نے پیدا کر

پیدا کر دیا تھا کہ نیا منشی بہت عرصے سے اس کے پاس ہے مگر منشی نے کہا تھا کہ وہ ڈیڑھ مہینے سے یہاں ہے۔ بہرحال سارا معاملہ شک و شبے پر چل رہا تھا۔ تفتیش، بالکل عربی زبان کی طرح ہوتی ہے۔ زیر اور زبر کے فرق سے معانی ہی بدل جاتے ہیں۔ میں زیر دوں اور زبروں کے رحم و کرم پر چل رہا تھا۔

سیٹھ کے ان پانچ ملازموں سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ پہلا منشی مسلمان تھا اور آٹھ سال سے سیٹھ کے پاس تھا۔ وہ سیٹھ کے گھر جایا کرتا تھا۔ شام کے وقت اس کے بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ سیٹھ کو اس پر بہت بھروسہ تھا۔ اتنا زیادہ کہ پچاس پچاس ہزار کیش بنک میں لے جاتا اور لاتا تھا۔ کوئی ڈیڑھ ایک مہینہ ہوا سیٹھ اور منشی میں کوئی ایسا جھگڑا ہو گیا جس کے متعلق کسی کو معلوم نہیں کیا تھا۔ منشی نے جاتے جاتے سیٹھ کو یہ دھمکی دی تھی ــــ "سیٹھ ہوشیار رہنا"۔ اس کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

مجھے میدان میں بکھرے ہوئے ٹرنکوں وغیرہ کے قریب سے دو تصویریں ملی تھیں جو کشیدہ کاری کی ایک کتاب میں رکھی تھیں۔ میں نے ایک تصویر جو سیٹھ کی فیملی گروپ فوٹو تھی دانستہ سامنے نہ کی۔ دوسری تصویر جو پاسپورٹ سائز تھی، ان ملازموں کو دکھائی۔ سب نے یک زبان کہا۔ "یہ اس منشی کی تصویر ہے"۔

اب آپ غور کیجیے کہ مسلمان منشی کی تصویر سیٹھ کے گھر میں رکھے ہوئے ایک ٹرنک میں پڑی تھی اور یہ کشیدہ کاری کی ایک کتاب میں سے برآمد ہوئی۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ کشیدہ کاری کی کتابیں صرف عورتیں اپنے پاس رکھتی ہیں۔ مردوں کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان منشی کا سیٹھ کے گھر میں ضرورت سے زیادہ عمل دخل تھا۔ سیٹھ کی ایک ہی بیٹی تھی جس کی عمر ساڑھے چھ سال تھی۔ سیٹھ کی بیوی

کی عمر تیس اور پنیتس کے درمیان تھی تو کیا منشی اور سیٹھانی کے خفیہ مراسم تھے؟ کیا اس کی تصویر سیٹھانی نے کشیدہ کاری کی کتاب میں چھپا کے رکھی ہوئی تھی؟

یہ سوال میرے ذہن میں آئے لیکن مجھے دلچسپی صرف اس سوال کے ساتھ تھی، کیا مسلمان منشی گھر کا بھیدی تھا اور یہ نقب زنی اُس کی رہنمائی سے ہوئی؟ اس نے سیٹھ کو دھمکی دی تھی کہ سیٹھ ہوشیار رہنا۔ دوسری تصویر میں ایک راز تھا۔ وہ میں نے انہیں نہ دکھائی۔ یہ میرا خیال تھا کہ اس میں ایک راز ہے۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ ان ملازموں میں صرف ایک تھا جسے مسلمان منشی کے گھر کا علم تھا۔ چار دس دیہاتی تھے۔ باہر سے آیا کرتے تھے۔

انہیں فارغ کر کے میں اُس آبادی میں چلا گیا جہاں بتایا گیا تھا کہ مسلمان منشی رہتا ہے۔ تھوڑی دقت سے مجھے اس کا مکان ملا مگر باہر تالا لگا ہوا تھا۔ محلے والوں سے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ تقریباً پچیس دن گزرے منشی کہیں چلا گیا ہے۔ یہ اس کا اپنا مکان تھا۔ اس میں اس کے والدین، وہ خود اور اس کی ایک چھوٹی بہن رہتی تھی۔ ایک سال گزرا باپ مر گیا اور تین چار ماہ بعد منشی کی ماں بھی مر گئی۔ منشی اور اس کی بہن رہ گئے۔

منشی دس جماعتیں پاس تھا۔ پاس ہوتے ہی اس ہندو سیٹھ کے پاس منشی لگ گیا تھا۔ اُس وقت منشی کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ اس کی بہن کی عمر بیس بائیس سال تھی۔ بہن کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ شریف اور پردہ نشین لڑکی تھی لیکن منشی کا میل جول شہر کے مشکوک لوگوں کے ساتھ تھا۔ جوا بھی کھیلتا تھا۔ رعب داب والا آدمی تھا۔ محلے میں اس نے کبھی بدمعاشی نہیں کی تھی نہ ہی اس کے خلاف کسی کو کوئی شکایت تھی۔

ڈیڑھ ایک مہینہ گزرا اس کی بہن کہیں باہر نکلی اور آج تک واپس نہیں آئی۔ میں نے ان [illegible] سے جرح کی۔ کسی ایک نے بھی شک تک کا اظہار نہیں کیا کہ لڑکی ایسی

ویسی تھی۔ سب کہتے تھے کہ لڑکی خوبصورت تھی اور بے حد شریف۔ اڑوس پڑوس کی لڑکیوں کے سوا اس کا میل جول کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ لوگ من گھڑت قصوں قصے اور معصوموں کو بدنام کر دیا کرتے ہیں۔ یہ لڑکی گھر سے غائب ہو گئی تھی پھر بھی اس کے محلے والے اس کی شرافت کو مانتے تھے۔ یہ ثبوت تھا کہ لڑکی واقعی شریف تھی۔

اس کے جانے کے بعد منشی بہت پریشان رہا۔ بہن کو تلاش کرتا رہا۔ مگر وہ اسے نہ ملی۔ محلے والوں نے اسے کہا کہ وہ تھانے رپورٹ درج کرا دے۔ معلوم نہیں وہ تھانے گیا تھا یا نہیں۔ یہ علاقہ ہندوؤں کی اکثریت کا تھا۔ تجارت اور اصل حیثیت صرف ہندوؤں کی ملکیت تھی۔ مسلمان کارکی، مزدوری یا انتہائی معمولی قسم کی دکانداری کرتے تھے۔ دس گھروں کے درمیان ایک مسلمان کا گھر تھا۔ لہٰذا محلے دار منشی کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ کوئی پچیس روز گزرے منشی بھی کہیں چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔

میرے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان سے مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات ملنے لگیں۔ مجھے دو مشکوک کردار کے آدمی معلوم ہو گئے جن کے ساتھ منشی کا میل جول تھا۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ جب منشی کی بہن غائب ہوئی تو اس کے بعد اس نے کبھی ہندو سیٹھ کے خلاف بات کی تھی؟

ایک آدمی نے بتایا کہ اس نے ایک روز منشی سے پوچھا تھا کہ بہن کا کچھ پتہ چلا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر باتوں باتوں میں اس نے ہندو سیٹھ کو گالیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ اس ہندو سیٹھ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ سیٹھ کے ساتھ اس کی کیا گڑبڑ ہوئی تھی۔ اس نے سیٹھ کی نوکری چھوڑ دی تھی۔

میں تھانے چلا گیا اور ان دو مشتبہ کردار کے آدمیوں کو بلوایا جن کے ساتھ منشی کا

اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کے آنے تک میرے ذہن میں یہ سوال آئے کہ منشی کی بہن غائب ہے، خوبصورت ہے۔ کیا ہندو سیٹھ نے اسے اغوا کرایا ہوگا؟ شک اس لیے پیدا ہوا تھا کہ منشی سیٹھ کو دھمکی دے کر نکلا تھا اور ایک محلے دار سے بھی اُس نے کہا تھا کہ اس سیٹھ کو نہیں چھوڑوں گا۔ منشی نے اپنی بہن کی گمشدگی کے بعد نوکری چھوڑ دی تھی۔

دوسرا یہ سوال میرے سامنے آیا کہ سیٹھ نے مسلمان کی جگہ ہندو منشی رکھنے کے لیے مسلمان کو نوکری سے نکال دیا ہوگا۔ مسلمان منشی چونکہ غنڈوں بدمعاشوں کی منڈلی کا آدمی تھا، اس لیے اس نے سیٹھ کو دھمکی دی تھی۔ تو کیا سیٹھ کے گھر نقب لگوانا انتقامی کارروائی تھی؟ منشی گھر بھیدی ضرور تھا۔ وہ سیٹھ کے گھر جاتا تھا۔ دو گھنٹے روزانہ اس کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اسی لیے ٹرنک وہی نکالے گئے جن میں مال تھا لیکن کشیدہ کاری کی کتاب سے منشی کی تصویر کی برآمدگی میرے ذہن میں کچھ اور شکوک پیدا کر رہی تھی اور پھر ایک یہ شک بھی میرے دل میں آ رہا تھا کہ میں کہیں بلا وجہ شکوک میں تو نہیں اُلجھ گیا؟

وہ دو آدمی آ گئے جنہیں میں نے بلوایا تھا۔ یہ دونوں گذشتہ رات بھی آئے تھے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ مسلمان منشی کا ان کے ساتھ میل جول تھا۔ منشی کبھی کبھی جوا کھیلا کرتا تھا۔ چوری چکاری کا عادی نہیں تھا۔ اس نے کبھی شراب اور چرس نہیں پی تھی۔ وہ سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ بدمعاشوں میں اس کا اثر و رسوخ تھا۔ لٹھ باز اور گھونسے باز تھا۔ ان دونوں نے یہ انکشاف کیا کہ ہندو سیٹھ کو غنڈوں کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ دونوں سیٹھ سے کبھی کبھار پیسے لیتے تھے اور یہ پیسے انہیں منشی کی معرفت ملتے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ چار اور انہی کی قماش کے آدمی تھے جو سیٹھ کے اشارے پر ہر کام کر گزرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان سب میں صرف ایک ہندو تھا باقی سب مسلمان تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ مسلمان کے حصے میں غنڈہ گردی ہی آئی تھی اور وہ ہندو لے کرائے کے غنڈے تھے۔ میں نے انہیں وعظ نہیں سنایا نہ ڈرایا دھمکایا۔ میں نے ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ رکھا۔ دوسرے کو بھیج دیا۔ یہ ایک بار کا سزا یافتہ تھا۔ اس نے ایک دکان کا تالا توڑا تھا۔ میں نے اسے سیدھے الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر وہ اور اس کا ساتھی نقب زنی میں شریک تھا تو بول پڑے۔ میں اسے سلطانی گواہ بنا لوں گا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس قسم کے جرائم پیشہ افراد کو پولیس انسپکٹر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے انکار کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اگر انسپکٹر ہوشیار ہو تو وہ اس انکار میں سے اقرار کی بُو پا لیتا ہے مگر اس شخص کا انکار صحیح معلوم ہوتا تھا۔ اسے میں نے چار گھنٹے اپنے ساتھ رکھا اور جرح سے بے حال کر دیا۔

یہ آدمی منشی کے متعلق کافی کچھ جانتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ سیٹھ کے ساتھ منشی کی کیا گڑبڑ ہو گئی تھی؟ اس نے کچھ انکشافات کیے مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ منشی کہاں چلا گیا ہے۔ میں نے اس سے چند اور ضروری باتیں پوچھیں اور اسے بھی چھٹی دے دی۔ میں نے منشی کے گھر کی تلاشی ضروری سمجھی۔ قانون کے تقاضے پورے کر کے میں نے مجسٹریٹ کو اور محلے کے دو عقل مند قسم کے آدمیوں کو ساتھ لے کر مسلمان منشی کے مکان کا تالا توڑا۔ یہ تین کمروں کا درمیانہ درجے کا مکان تھا۔ عام قسم کا گھریلو سامان پڑا تھا۔ ٹرنک زیادہ نہیں تھے۔

میں نے بڑی احتیاط سے تلاشی لی۔ ایک الماری میں کچھ کپڑے، کتابیں اور کچھ پرانے اخبار رکھے تھے۔ منشی کا ذوق دیکھنے کے لیے میں نے کتابیں دیکھنی شروع کر دیں۔ یہ سب ناول تھے۔ ایک ناول میں سے ایک تصویر گری۔ میں نے اُٹھا لی۔ ایسی تصویر میں پہلے بھی دیکھ چکا

تھا۔ راز کچھ کچھ کھلتا جا رہا تھا۔ تصویر کی اُلٹی طرف ہندی میں ایک فقرہ لکھا تھا۔ میں ہندی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ مجسٹریٹ سے پڑھوایا لکھا تھا۔ "بھگوان کے بعد تم ہو"۔ تصویر نے مجھے چونکا دیا اور ایسے لگا جیسے میرا بخار اُتر گیا ہو۔ مجھے خوشی اس پہ ہوئی کہ میں غلط لائن پر نہیں جا رہا تھا۔ میں نے تصویر کی برآمدگی کا باقاعدہ مشیرنامہ تحریر کیا اور جن دو آدمیوں کو میں نے ساتھ رکھا تھا ان کے دستخط لیے۔

میں نے مکان کے اندر کے دروازے بند کر کے لاکھ سے سربمہر کر دیئے۔ پھر باہر کے دروازے کے ساتھ اپنا تالا لگا کر سربمہر کر دیا۔ کانسٹیبل سے کہا کہ ہندو سیٹھ سے جا کے کہو کہ فوراً تھانے پہنچے۔ میں تھانے چلا گیا۔ اے ایس آئی ملزم کو ضلع ہیڈ کوارٹر میں لے گیا تھا۔ انہیں اگلے روز واپس آنا تھا۔ اب میرا اور سیٹھ کا معرکہ تھا۔ میں اس کے آنے تک دماغ پر زور دے کر سوال سوچتا رہا اور سوالوں کے اشارے کاغذ پر لکھ لیے۔

## بملا جوان تھی

سیٹھ آ گیا۔ میں نے اُسے احترام سے بٹھایا اور پوچھا "آپ کے گھر کے افراد کتنے ہیں؟ ان کی تفصیل بتا دیں"۔

"اس سوال کا جواب میں آپ کو دے چکا ہوں"۔ — اُس نے کہا۔ "آپ کا فرض ہے کہ ایسی معلومات نوٹ کر لیا کریں"۔

"نوٹ کرنے کی ضرورت نہیں"۔ — میں نے کہا۔ "مجھے آپ کا جواب زبانی یاد ہے۔ ایک بیوی، ایک بیٹا، عمر تیرہ سال۔ دوسرا بیٹا، عمر نو سال اور ایک بیٹی، عمر ساڑھے

"چھ سال"۔

"دوبارہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟"

"ضرورت یہ پیش آئی ہے کہ آپ اپنے خاندان کے ایک اہم فرد کو بھول گئے ہیں"۔

میں نے کہا ۔۔۔ "اگر وہ فرد مر چکا ہے تو اور بات ہے"۔

"آپ مجھ سے سیدھی سیدھی بات کیوں نہیں کرتے"۔۔۔ اس نے سٹپٹا کر کہا۔ "آپ معلوم کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"سیٹھ صاحب"۔۔۔ میں نے بڑے تحمل سے کہا ۔۔۔ "میں آپ کو یاد دلا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ آڑھت کی ایجنسی میں نہیں، تھانے میں بیٹھے ہیں۔ میں آپ کا خادم ہوں، میرا ذرہ بھر احترام نہ کریں، قانون کا احترام کریں۔ میرا فرض بڑا ہی ناخوشگوار ہے۔ میرے ساتھ تعاون کریں"۔

"بھائی صاحب!"۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔ "میں نے آپ کو گھر کے جو افراد بتائے تھے وہی ہیں۔ ان دو تین دنوں میں میری اولاد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا"۔

"آپ کے تمام بچے زندہ ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی فوت تو نہیں ہوا؟"

"نہیں"۔

"بملا کہاں ہے؟" میں نے آگے ہو کر رازداری سے پوچھا۔

اُس کے چہرے کا اتنا صحت مند رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ وہ تھا تو ہوشیار آدمی لیکن سورج کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے نہ دیا اور پوچھا۔ "سیٹھ صاحب! آپ کی بیٹی بملا کہاں ہے؟"

"کون بملا؟" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے وہ فیملی گروپ فوٹو اس کے آگے رکھ دی جو مجھے کشیدہ کاری کی کتاب سے ملی تھی۔ اس نے فوٹو میز سے اٹھانی چاہی لیکن میں نے پیچھے کر لی اور اس فیملی گروپ فوٹو کی ایک اور کاپی اس کے سامنے رکھ دی۔ یہ مجھے مسلمان منشی کے گھر سے ایک ناول میں سے ملی تھی۔ میں نے سیٹھ کو اس کاپی کی الٹی طرف دکھائی۔ ہندی میں لکھا تھا — "بھگوان کے بعد تم ہو — بملا" — کشیدہ کاری کی کتاب پر بھی "بملا" لکھا ہوا تھا۔

سیٹھ نے سخت چوٹ کھائی مگر سنبھل گیا۔ میں نے اسے ابھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی جوان بیٹی کی کشیدہ کاری کی کتاب میں سے اس کے مسلمان منشی کی فوٹو بھی نکلی ہے۔

وہ سنبھل کر بولا۔ "مسٹر احمد یار! میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی تفتیش کو چوری کی اس واردات تک محدود رکھیں۔ میں قانون شاید آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ میرے بیوی بچوں کے ساتھ آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ جوان لڑکی جو گروپ فوٹو میں ہے، میری کچھ لگتی ہے یا نہیں، اس کا واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جب آپ سے کہوں گا کہ مجھے اس لڑکی پر شک ہے تب آپ مجھ سے پوچھنا کہ یہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔ پھر میں آپ کو اس کے متعلق ساری معلومات دے دوں گا۔"

"آپ نے پہلے منشی کو نوکری سے کیوں نکالا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بے ایمان تھا" — اس نے کہا — "بددیانت تھا۔"

"بددیانتی کی صرف ایک مثال دیجئے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب یہ احتیاط ضرور کیجئے گا کہ آپ کے منہ سے نکلا ہوا کوئی بھی لفظ یا الفاظ آپ کے خلاف استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ میں ایک بار پھر پوچھتا ہوں کہ یہ لڑکی کون ہے؟"

"میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرا گھر لٹ گیا ہے اور آپ

لڑکیوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں"۔

"آپ کی بیٹی بملا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فرض کر لو کہ یہ لڑکی میری بیٹی ہے تو کیا اس نے میرے گھر ڈاکہ ڈلوایا ہے؟"

"آپ کے گھر میں جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں" میں نے کہا۔ "ڈاکے کے بعد صورت بدل گئی ہے۔ اب اگر آپ اپنی رپورٹ واپس لے لیں گے اور کہیں گے کہ آپ کے گھر نقب نہیں لگی اور کوئی نقصان نہیں ہوا تو بھی میں اپنی تفتیش مکمل کر دوں گا۔ اور سنو سیٹھ!" میں نے ہلکے سے دبدبے سے کہا۔ "مجھے ابھی آپ سے ایسے سوال پوچھنے ہیں کہ آپ کی ساری سوشل حیثیت ایک سیکنڈ میں ختم ہو جائے گی۔ میں نے ایک مجرم کو گرفتار کر لیا ہے۔ ہوش میں آؤ سیٹھ"۔

وہ گھبراہٹ کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔ "مجھے ذرا سوچنے کی مہلت دے سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟" میں نے کہا۔ "آپ ملزم تو نہیں۔ آپ بے شک گھر چلے جائیں۔ اطمینان سے سوچیں"۔ میں نے اُسے جال میں پھانسنے کے لیے اس کے ذہن سے بوجھ اُتار دینا چاہا اور کہا۔ "آپ نے کہیں نقب نہیں لگائی بلکہ آپ کے گھر میں نقب لگی ہے۔ مجھے مجرموں کو پکڑنا ہے اور آپ کا مال برآمد کرنا ہے"۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نے یہ سوچا کہ اسی دوستانہ لہجے میں اسے دھمکا بھی دیا جائے۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کو یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے کچھ ایسے واقعات کا بمع ثبوت علم ہوا ہے جو براہِ راست آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اگر مجھے اپنے دل میں چھپی باتیں بھی بتا دیں گے تو ہم دونوں کے لیے بہتر ہو گا"۔

یہ صحیح ہے کہ میں نے اس پر پھینکنے کے لیے دو بم رکھے ہوئے تھے مگر مجھے یہ اشارہ نہیں دینا چاہیئے تھا جو میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں ایسے آدمی کو دھمکی دے رہا ہوں جو میرے خلاف جلوس بھی نکلوا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ شام کو سامنے آ گیا۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا کہ چند ہندو آئے۔ ان میں سیٹھ بھی تھا۔ اس نے تعارف کرایا۔ ان میں ایک اس ضلعے کی کانگرس پارٹی کا صدر تھا اور باقی سیاسی لیڈر اور تاجر تھے۔ ان کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ وہ مجھ پر یہ الزام عائد کرنے آئے تھے کہ میں چونکہ مسلمان ہوں اس لیے میں ایک ہندو سیاسی لیڈر (سیٹھ) کو پریشان کر رہا ہوں۔ میں نے ان سے بہت بحث کی لیکن ان کا لب و لہجہ اور رویہ توہین آمیز تھا۔ انہوں نے میری تفتیش کو ہندو مسلم مسئلہ بنا دیا۔

کانگرس کے ضلعی صدر نے کہا۔ ”آپ اس شہر میں جانے کہاں سے آئے ہیں۔ آپ پاکستان کہیں اور جا کر بنائیں۔ یہ ہندوؤں کا شہر ہے۔ اگر آپ سے اس واردات کے مجرم نہیں پکڑے جاتے تو جواب دے دیں۔“

وہ مجھے مشتعل کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ میں اُلٹی سیدھی باتیں کر گزروں اور وہ اپنے الزامات صحیح ثابت کر دیں لیکن مجھے اپنے آپ پر پورا قابو تھا۔

ایک ہندو نے کہا۔ ”ان (سیٹھ) سے ایسے سوال پوچھو جن کا تعلق واردات سے ہے۔“

”لالہ جی!“ میں نے کہا۔ ”میں ٹریننگ لے کر تھانیدار بنا تھا۔ مجھے مزید ٹریننگ کی ضرورت نہیں۔ میں وہ سوال پوچھوں گا جو میں بہتر سمجھوں گا۔ میں جو کچھ پوچھنا چاہوں گا وہ میں ضرور پوچھوں گا۔“

"ہم کمشنر کے پاس جا رہے ہیں" ۔ صدر نے کہا ۔ "آپ ایک ہندو لیڈر کو ہراساں کر رہے ہیں جس کا ایک لاکھ روپے کا نقصان ہو گیا ہے اور آپ انہیں صرف اس لیے ہراساں کر رہے ہیں کہ مجرم مسلمان ہیں ۔ آپ انہیں پکڑنا نہیں چاہتے ۔"

"آپ کمشنر کے پاس جائیے ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا ۔ "میں آپ کے ساتھ اور کوئی بات نہیں کروں گا ۔"

انہوں نے آپس میں کھسر پھسر کی اور ایک نے ٹیلیفون پر ہاتھ رکھ کر دوسروں سے کہا ۔ "میں کمشنر کے لیے کال یہیں سے بک کر لیتا ہوں ۔"

میں نے ٹیلیفون اپنی طرف گھسیٹ کر کہا ۔ "یہ کانگرس کا دفتر نہیں پولیس سٹیشن ہے ۔ جائیے کسی پرائیویٹ فون پر کال بک کرائیے ۔"

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ قوم ایک مسلمان کے خلاف کس حد تک پہنچ سکتی ہے ۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ سیٹھ نے اپنی کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان سب کو استعمال کیا تھا یا یہ سب مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے ۔ بہرحال میں جو کچھ سمجھ سکا وہ یہ تھا کہ اگر میں ان کافروں سے دب گیا تو میں مسلمان کی حیثیت سے اور پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے ان کا غلام ہو جاؤں گا اور جیتے جی مر جاؤں گا ۔ میں اکیلا تھا ۔ جس طرح یہ ہندو لیڈر متحد ہو کر مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے اس طرح شہر کے مسلمانوں سے میں اتحاد کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا ۔ ان کی وہاں کوئی پوزیشن نہیں تھی ۔ اب مجھ اکیلے کا مقابلہ اتنے سارے ہندو لیڈروں سے تھا ۔ وہ مجھے کمشنر کی دھمکی دے کر چلے گئے ۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر ایکسچینج کو بلایا ۔ آپریٹر سے کہا کہ میں تھانہ انچارج احمد یار خان بول رہا ہوں ۔ ایس پی صاحب کی کال بک کرو لیکن فوراً ملا دو ۔

اگر وہ دفتر میں نہ ہوں تو ان کے گھر کا نمبر ملوا دو۔ یہ ایس پی انگریز تھا۔ ایک دیسی تھانیدار کی ایک انگریز ایس پی کے سامنے حیثیت وہی تھی جو پاکستان کے وزیر اعظم کے سامنے کسی پرائیویٹ کمپنی کے چپڑاسی کی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ انگریز اپنے قانون کے تحفظ کے لیے سب کچھ قبول جاتا ہے۔

ایکسچینج نے تھوڑی سی دیر میں مجھے ایس پی کے پی اے سے ملا دیا۔ وہ بھی انگریز تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ ایک تھانے کا ایس۔ایچ۔او، ایس پی سے بات کرنا چاہتا ہے تو اُس نے بادشاہوں کے لہجے میں پوچھا۔ "کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اسے نقب زنی کی واردات کے متعلق بتایا اور شکایت یہ کی کہ یہاں کے کانگرسی لیڈر مجھے تھانے میں آکر دھمکیاں دے گئے ہیں۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اس واردات کے اندر بھی ایک واردات ہے۔ میں صرف یہ حکم لینا چاہتا ہوں کہ میں ان کانگرسی ہندوؤں کو خوش کروں یا شہنشاہِ برطانیہ کے قانون کو۔

انگریز کو اپنی بات پر لانے کے لیے میں نے "شہنشاہِ برطانیہ" پر زیادہ زور دیا۔ پی اے نے کوئی اور سوال کیے بغیر مجھے ایس پی سے ملا دیا۔ اُس کا نام اے سی کیمبل تھا۔ اُسے پولیس کے پرانے افسر کم ہی جانتے ہوں گے۔ وہ نیا نیا انگلینڈ سے آیا تھا۔ سُنا تھا کہ پندرہ سال پہلے وہ انسپکٹر کے عہدے سے ہندوستان میں رہ چکا تھا۔ اُردو بہت اچھی بولتا تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ ہندوستانیوں سے سخت نفرت کرتا تھا اور وہ تشدد کا قائل تھا۔ کسی بھی مسلمان، ہندو اور سکھ سیاسی لیڈر کا نام بھی نہیں سُننا چاہتا تھا۔ وہ واپس انگلینڈ چلا گیا تھا۔ پندرہ سال بعد وہ ایس پی کے عہدے سے پھر ہندوستان میں آیا اور اُسے میرے تھانے والا ضلع دیا گیا۔

اب یہاں کے سیاسی حالات کچھ اور تھے۔ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ انگریز اب ہندوستانیوں

کو فوجی بھرتی کی خاطر خوش رکھنا چاہتا تھا۔ مگر کیمپل صاحب کا رویہ وہی تھا جو پندرہ سال پہلے تھا۔ وہ صرف چار مہینے ہندوستان میں رہا پھر اسے واپس بھیج دیا گیا تھا۔ میں اُس کی عادت سے واقف تھا۔ اس کے پی اے نے مجھے اس سے ملا دیا تو میں نے اُسے وہی باتیں بتائیں جو اُس کے پی اے کو بتا چکا تھا۔ اُس نے ہندو لیڈروں کو ایک گالی دی اور صرف اتنا کہا۔ "میں کل آ رہا ہوں۔"

# میں نے بم پھینک دیا

دوسرے دن ساڑھے نو بجے وہ اچانک پہنچ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی آ جائے گا۔ میری کرسی پر بیٹھ کر اُس نے کہا۔ "بہت جلدی جلدی بتاؤ کیا معاملہ ہے۔" میں نے بتا دیا لیکن جو باتیں ابھی چھپا کے رکھی ہوئی تھیں وہ نہ بتائیں۔ یہی بہتر سمجھا۔ اُس نے کہا "اُن سب کو فوراً بلاؤ۔" میرا اے۔ ایس۔ آئی ملزم کو لے گیا ہوا تھا میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ میں ابھی ان لیڈروں کے گھروں وغیرہ سے واقف نہیں ہوں انہیں ڈھونڈو اور فوراً تھانے لے آؤ۔ ہیڈ کانسٹیبل پرانا آدمی تھا۔ میں اس کی پھرتی کی داد دیتا ہوں۔ اس نے نصف گھنٹے میں پانچوں لیڈروں کو ہندو سیٹھ سمیت تھانے میں اکٹھا کر لیا۔ اپنے سامنے بٹھا کر ایس پی نے اُن سے پوچھا۔ "تمہیں اس انسپکٹر کے خلاف کیا شکایت ہے؟"

ضلعے کے کانگرسی صدر نے کہا۔ "یہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہندو کے نقصان پر خوش ہے۔ تفتیش میں ٹال مٹول کر رہا ہے۔ مجرموں کو پکڑنے کی بجائے لڑکیوں کے چکر میں

پڑا ہوا ہے۔ اسے اتنا بھی خیال نہیں کہ جس کے گھر ڈاکہ پڑا ہے وہ کتنا بڑا آدمی ہے اور وہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہے۔ اسے حکم دیا جائے کہ طریقے سے تفتیش کرے اور شریف اور باحیثیت لوگوں کو بار بار تھانے بلا کر ہراساں نہ کرے۔"

ایس پی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔" وہ ایس۔ ایچ۔ او یہاں سے چلا گیا ہے جو تفتیش میں ٹال مٹول کیا کرتا تھا۔" میں نے ہندو سیٹھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس نے ایک لڑکی کے اغوا کا کیس رجسٹر نہیں کیا تھا کیونکہ وہ لڑکی مسلمان تھی۔"

" تم اس لڑکی کو چھوڑو۔" ایک ہندو نے کہا۔" ہم نقب زنی کے اس کیس کی بات کر رہے ہیں۔"

" میں بھی اسی کیس کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے وہ بم پھینک دیا جو کسی اور موقع کیلئے رکھا ہوا تھا۔ مجھے مسلمان منشی کا جرائم پیشہ دوست بہت کچھ بتا گیا تھا۔ میں نے کہا ۔۔۔ "نقب زنی کے اس کیس کے ساتھ اس لڑکی کے اغوا کا گہرا تعلق ہے۔"

مجھے ابھی پوری طرح یقین نہیں ہوا تھا کہ مجھے جو اطلاعیں ملی ہیں وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ دو تصویریں مجھے حوصلہ دے رہی تھیں۔ یہ محض میری خود اعتمادی اور تجربہ تھا کہ میں نے ایک الزام توپ کی طرح داغ دیا۔ میں نے کہا۔" جب تک یہ لڑکی برآمد نہیں ہوگی نقب زنی کی واردات کی تفتیش مکمل نہیں ہوگی۔"

" نقب میرے گھر میں لگی ہے۔" ہندو سیٹھ نے کہا۔" میں کسی ایسی لڑکی کو نہیں جانتا جس کا تعلق میرے گھر سے ہو۔"

" آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے اسے کہا اور پھر ایس پی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جناب! وہ لڑکی اس سیٹھ نے اغوا کرائی ہے۔ اس سے آپ یہ پوچھیں کہ اس کی اپنی بیٹی کہاں ہے؟"

سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے ایک مسلمان کانسٹیبل اور عیسائی محرر کو بلا لیا۔ میں ان سے مسلمان لڑکی کے اغوا کے متعلق کچھ معلومات کی تصدیق کرا چکا تھا۔ یہ میرے یہاں آنے سے پہلے کی واردات تھی۔ اس عیسائی محرر سے میں نے کہا کہ صاحب بہادر کو بتاؤ کہ پہلے ایس۔ ایچ۔ او نے مسلمان لڑکی کے اغوا کا کیس رجسٹر نہیں کیا تھا۔ اُس نے سنا دیا کہ ایک مسلمان یہ رپورٹ دینے آیا تھا کہ اس کی غیر شادی شدہ بہن لاپتہ ہو گئی ہے۔ اُس نے اس ہندو سیٹھ پر شک کا اظہار کیا تھا۔ ایس۔ ایچ۔ او ہندو تھا۔ اس نے اس مسلمان کو پہلے ٹالا پھر ڈرایا اور بعد میں یہ کہہ کر تھانے سے نکال دیا کہ تمہاری بہن اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔

ایس پی نے پوری بات نہ سُنی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کیس میں کوئی اور گڑبڑ ہے۔ اُس نے ہندو لیڈروں کو اپنی عادت کے مطابق بڑی بیہودگی سے ڈانٹ کر باہر نکل جانے کو کہا۔ وہ سب اُٹھ کر باہر کو چلے تو میں نے ہندو سیٹھ کا بازو پکڑ کر کہا "آپ یہیں تشریف رکھیں۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ سیٹھ صاحب کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور اگلے حکم تک اپنے ساتھ ہی رکھو۔ ہیڈ کانسٹیبل اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ ایس پی کے ساتھ ایک انگریز انسپکٹر بھی تھا۔ ایس پی نے مجھ سے تھانے کے پہلے تھانیدار کا نام پوچھ کر اپنے انسپکٹر کو نوٹ کرایا اور حکم لکھوایا کہ اُسے فوراً معطل کر کے انکوائری شروع کرا دو۔ ایس پی نے مجھے کہا کہ میں اس کے خلاف شہادت تیار کروں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ لڑکی کے اغوا کا نقب زنی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

میں نے اُسے وہ فوٹو دکھائے جو میدان میں پڑے ہوئے ٹرنک کے قریب سے کشیدہ کاری کی کتاب میں سے برآمد ہوئے تھے اور وہ فوٹو بھی مسلمان منشی کے گھر سے ناول سے برآمد ہُوا تھا۔ بملا ہندو سیٹھ کی جوان بیٹی تھی۔ منشی کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ مضبوط اور صحت مند جوان تھا۔ اس کی تصویر بملا نے اپنی کشیدہ کاری کی کتاب میں رکھی ہوئی تھی۔ بملا کے پاس اپنی اکیلی شاید کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس نے اپنا فیملی گروپ فوٹو اسے دے دیا تھا اور پیچھے لکھا تھا" بھگوان کے بعد تم ہو" ـــــ اس فقرے کے نیچے بملا نے اپنا نام لکھا تھا۔

منشی کے جرائم پیشہ دوست کی اطلاع کے مطابق ہندو سیٹھ نے منشی کی بہن کو اغوا کرا دیا تھا۔ اُدھر بملا لاپتہ تھی جسے ظاہر ہے کہ منشی لے گیا تھا۔ میرے شکوک کے مطابق نقب زنی اس منشی نے کروائی تھی اور یہ انتقامی کارروائی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس واردات میں بملا کا بھی ہاتھ تھا یا نہیں اور میں نے معلومات اور شکوک کو اینٹوں کی طرح جوڑ کر جو عمارت بنائی تھی وہ کتنی کچھ مضبوط تھی۔ میں نے یہ ساری شہادت ایس پی کو سُنا دی اور اسے کہا کہ منشی کی بہن برآمد ہو نہ ہو مجھے منشی کی تلاش ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ ایک ملازم کو میں نے خون کے معائنے کے لیے متعلقہ ایکسپرٹ کے پاس بھیجا ہُوا ہے۔

## اینٹ پر خون

ایس پی دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے خلاف ہندوؤں نے جو الزام عائد کیے ہیں وہ صحیح تو نہیں؟ میں نے اسے مطمئن کر دیا۔ اُس نے میری حوصلہ افزائی کی اور چلا گیا۔

وہ جتنی دیر میرے تھانے میں رہا میرا خون خشک ہوتا رہا۔

اُس کے جانے کے کچھ وقت بعد میرا اے۔ ایس۔ آئی ملزم کو لے کر واپس آگیا۔ اُس نے اُس کے خون کی بڑی تفصیلی رپورٹ کی ایک نقل مجھے دی۔ میں نے اُسے پہلی رپورٹ سے ملایا۔ خون کا گروپ اور دیگر کوائف ایک ہی جیسے تھے۔ اس ملزم کی گرفتاری کی وجہ یہ تھی کہ میں جب ہندو سیٹھ کی رپورٹ پر اُس کے ساتھ موقعۂ واردات پر گیا تھا تو میں نے دیوار میں لگی ہوئی نقب یعنی سوراخ کو غور سے دیکھا تھا۔ وہاں مجھے کوئی سراغ نہ ملا۔ سوراخ کے قریب، مجھے اینٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا جس کی لمبائی تین انچ سے ذرا کم تھی۔ یہ تکون شکل کا تھا۔ اس کی نوک خنجر کی نوک کی طرح تھی۔ اس نوک پر مجھے سُرخی نظر آئی۔ اُٹھا کر دیکھا تو شک ہوا کہ یہ سُرخی خون کی ہو سکتی ہے۔ سونگھا تو بُو خون کی ہی محسوس ہوئی۔

ایسی چیزیں جنہیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے بڑے کام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے گہری نظر چاہیے۔ میں نے یہ ٹکڑا ہاتھ میں لے کر دیوار کے سوراخ کو پھر غور سے دیکھا۔ اینٹیں سالم نکالی گئی تھیں۔ نقب زنی میں اینٹیں سالم ہی نکالی جاتی ہیں لیکن اس واردات میں ایک اینٹ ٹوٹ گئی تھی۔ اگلا حصّہ نکل گیا تھا۔ پچھلا حصّہ دیوار میں ہی رہ گیا تھا۔ یہ اس طرح ٹوٹی تھی کہ اس کا جو حصّہ دیوار میں رہ گیا تھا اس کی نوکیں بن گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھوٹا سا نوکیلا ٹکڑا اس اینٹ کے آگے رکھا تو یہ ایک جگہ فِٹ آگیا۔

میں نے دیکھا کہ جب یہ ٹکڑا اینٹ کے ساتھ تھا تو سوراخ کے راستے میں آتا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ پہلا آدمی اس سوراخ سے رینگ کر اندر گیا تو اس نوک نے اس کے کندھے یا بازو کو زخمی کر دیا ہوگا۔ اس کی نوک پر سُرخی اسی آدمی کے خون کی ہوگی۔ اُس نے خود یا

اپنے کسی ساتھی سے کہ کر اس اُوزار سے یہ نوک توڑ دی ہو گی جس سے اینٹیں نکالی گئی تھیں۔ اس طرح یہ ٹکڑا سوراخ سے الگ ہو گیا۔ اینٹ چونکہ زمین کے ساتھ تھی اور بہت ہی پُرانی تھی اس لیے اس میں سیم اور نمی تھی۔ نمی کی وجہ سے اینٹ کے ٹکڑے نے خشک اینٹ کی طرح خون چوسا نہیں تھا۔ میں نے اُسی وقت یہ ٹکڑا اے۔ ایس۔ آئی کو دے کر اسے کہا تھا کہ اُسے محفوظ طریقے سے کسی کانسٹیبل کے ہاتھ معائنے اور رپورٹ کے لیے بھیج دو۔

جب اگلے روز رپورٹ آئی تو میرا قیاس صحیح نکلا۔ یہ واقعی خون تھا۔ متعلقہ ماہر نے خون کا گروپ اور اس کی کثافت وغیرہ کی رپورٹ لکھ دی تھی۔ اس رپورٹ پر میں ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جس کے جسم پر تازہ زخم یا ذرا گہری خراش ہو۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ یہ کام پیشہ وروں کا ہے۔ چنانچہ میں نے شہر کے سزا یافتہ اور مشتبہ افراد کو تھانے میں بلایا اور سب کو قمیضیں اتارنے کو کہا۔

انہوں نے قمیضیں اتاریں تو میں نے سب کو ایک نظر دیکھا۔ ایک آدمی کے دائیں کندھے پر جہاں بازو کا جوڑ ہوتا ہے پھاہا چپکا ہوا تھا اور اس پر کراس کی شکل میں چپکنے والی ٹیپ لگی ہوئی تھی۔ روئی اور ٹیپ میلی نہیں تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ ایک آدھ دن سے زیادہ پُرانی نہیں۔ میں نے کسی سوال اور جواب کے بغیر اُسے حوالات میں بند کر دیا۔ پھر اُسے اُسی ایگزیمنر کے پاس اُس کے خون کے ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا۔ اس کے خون کے تمام تر کوائف وہی نکلے جو اینٹ کے ٹکڑے پر لگے ہوئے خون کے تھے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ اس ٹکڑے پر اسی آدمی کا خون تھا۔

میں نے اسے الگ بٹھا لیا۔ اس آدمی کے ریکارڈ پر چار گرفتاریاں یعنی چار مقدمے

تھے جن میں سے دو میں عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا اور دو میں اُسے سزا ملی تھی۔ اس کی سب سے پہلے والی واردات نقب زنی کی تھی جس میں تین افراد گرفتار ہوئے تھے۔ دو کو سزا ہو گئی تھی۔ یہ بچ گیا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے ذرا کم تھی۔ جسم، زبان اور دماغ پھرتیلا تھا۔ میں نے اس سے کوئی سوال پوچھنے کی بجائے یہ پوچھا۔ "مقدمہ لڑو گے یا اقبالی بیان دو گے؟"

"میرا جرم کیا ہے حضور؟"

"نقب زنی۔"

"کہاں؟"

"مجھ پر جرح نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں کچھ کہے اور پوچھے بغیر گرفتار کر لیا ہے۔ تم خود اُستاد ہو۔ یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس طرح صرف اُسے گرفتار کیا جاتا ہے جس کے خلاف کوئی ثبوت اور شہادت مل جائے۔"

"اگر آپ کے پاس ثبوت اور شہادت ہے تو چالان کاٹیے اور چلیے عدالت میں۔"

یہ آدمی پکّا استاد تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ تشدد برداشت کرنے کا عادی ہے۔

"تم اپنی ہسٹری شیٹ سے واقف ہو۔" میں نے اسے کہا۔ "عادی مجرم کو عموماً سلطانی گواہ نہیں بنایا جاتا۔ لیکن میں تمہیں سلطانی گواہ بنا لوں گا۔ ظاہر ہے کہ تم اکیلے نہیں تھے۔ تمہارے تمام ساتھی کل تک گرفتار ہو جائیں گے۔ تم مسلمان ہو اور میں بھی مسلمان ہوں۔ مجھ سے فائدہ اُٹھا لو۔"

"داروغہ جی!" اس نے عجیب سی مسکراہٹ سے جس میں شاید طنز بھی تھی، کہا۔ "عمر اسی چکر بازی میں گزر گئی ہے۔ پولیس کی بڑی مار کھائی ہے۔ اب تو لوہے کی سلاخ گرم

کر کے پیٹھ پر رکھ دو، اُف نہیں کروں گا۔ کوئی سا لالچ دے لو۔ اپنے پیر اُستاد کو بدنام نہیں کروں گا۔ آپ کے پاس ثبوت موجود ہے۔ سلطانی گواہ یا اقبالی بیان کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟"

اُس کے لب ولہجے میں استادوں والی خود اعتمادی تھی۔ میں نے خاصا وقت لگا کر اُسے گھیرنے کی کوشش کی لیکن میری تلقین اور ترغیب کو اُس نے بیکار کر دیا اور ثابت کر دیا کہ اُس کا پیر اُستاد کامل ہے۔ میں نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی پتھر ہے۔ تشدد اور لالچ کا اس پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا۔ مجھے اس کی پچھلی ساری تاریخ سنائی گئی۔

میں نے اسے ساتھ لیا اور اُس کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے لے گئے۔ یہ تلاشی صرف کاغذی کارروائی پوری کرنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا منجھا ہوا جرائم پیشہ گھر میں واردات کا کوئی سراغ نہیں رکھے گا۔ اُس کے گھر گئے۔ وہاں اس کی بیوی تھی اور تین بچے۔ بعض جرائم پیشہ افراد کی بیویاں اُن کی کمزوری بن جاتی ہیں کیونکہ وہ اپنے خاوندوں کے پیشے سے نفرت کرتی اور پولیس سے ڈرتی ہیں لیکن اس کی بیوی بھی جرائم پیشہ معلوم ہوتی تھی۔ پختہ کار عورت تھی۔ اُس کی آنکھیں مسکراتی تھیں۔ میں نے اس کے گھر کے برتن بھی اُلٹے کر دیئے۔ فرشوں کو بھی ٹھونکا مگر خاک بھی ہاتھ نہ آئی۔ مجھے یہی توقع تھی۔

ہندو سیٹھ کو میں نے تھانے میں بٹھا رکھا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ تلاشی کے بعد میرے دماغ میں ایک سوچ آئی۔ میں نے صرف ایک کانسٹیبل کو ساتھ رکھا اور اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ ملزم کو حوالات میں لے جائے اور کاغذات تیار کر کے اس کا ریمانڈ لے لے۔ میں نئی سوچ کے مطابق ہندو سیٹھ کے گھر چلا گیا۔ سیٹھانی سے ملا۔ وہ سیدھی سادھی ہندوانی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور پھر تسلی دلاسہ دے کر کہا

کہ اُن کا سارا مال واپس مل جائے گا۔ اُس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اُس کے دل میں اعتماد پیدا کر لیا۔

"بملا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا، اور اُس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھا۔ میں نے پینترا بدل کر پوچھا۔ "اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہاں چلی گئی ہے؟"

اُس کا سر جھک گیا۔ میں نے لہجے میں ہمدردی کا بڑا گہرا رنگ بھر کر کہا۔ "آپ غم نہ کریں۔ میں آپ کے پہلے منشی کو دو دنوں میں زمین کے نیچے سے بھی نکال لاؤں گا۔" اُس نے سر اٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اُسے کہا۔ "سیٹھ صاحب کو چاہیئے تھا کہ مجھے پہلے روز ہی یہ بات بتا دیتے۔ انہوں نے آج صبح بتایا ہے کہ آپ کی بیٹی کو وہ نمک حرام منشی ورغلا کر کہیں لے گیا ہے..... آخر یہ بات بنی کیسے؟ منشی کو اتنا موقعہ مل کیسے گیا تھا؟"

وہ میرے چکر میں آگئی۔ میرا یہ جھوٹ کام کر گیا کہ سیٹھ نے مجھے بملا کے متعلق بتا دیا ہے۔ سیٹھانی نے کہا۔ "انہوں (سیٹھ) نے مجھے منع کیا تھا کہ بملا کے متعلق پولیس کو کچھ نہ بتانا۔ بڑی رسوائی ہوگی۔ اگر نقب زنی کے ملزم پکڑے گئے تو عدالت میں بھی لڑکی کا نام آئے گا۔ ساری دنیا سُنے گی۔ مگر انہوں نے خود ہی آپ کو بتا دیا ہے۔"

## جوان بیٹی غائب ہوگئی

سیٹھانی نے مجھے بتایا کہ منشی بچّوں کو پڑھانے گھر آیا کرتا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود اُسے یہ لوگ گھر کا فرد سمجھتے تھے۔ وہ زندہ دل اور چالاک آدمی تھا۔ جوان بھی تھا۔ سیٹھ

کی جوان لڑکی بملا کی اُس کے ساتھ بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ لڑکی کے ماں باپ نے توجہ نہ دی۔ منشی نے اپنا اعتماد پیدا کر رکھا تھا۔ گھر کے کئی انتظامات اُسی کے سپرد تھے۔ وہ گھر بھیدی بن گیا تھا۔ وہ آٹھ نو سال ان کے ساتھ رہا۔ اس عرصے میں اُس نے سیٹھ کی بیٹی کے دل پہ پوری طرح قبضہ کر لیا۔

ڈیڑھ مہینہ گزرا سیٹھ کو پہلی بار شک ہوا۔ اس کے بعد منشی کی حرکات کو چوری چھپے دیکھا جانے لگا۔ سیٹھ نے ایک روز اُسے موقعہ پر پکڑنے کے لیے کہا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ دن بھر کے لیے باہر جا رہا ہے۔ سیٹھ اور سیٹھانی چھوٹی بچی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دوسرے بچے سکول چلے گئے۔ گھر کے نوکر کو شام تک دانستہ چھٹی دے دی گئی۔ بملا گھر میں اکیلی رہ گئی۔ منشی دکان پر تھا۔ سیٹھ اور سیٹھانی کے جانے کے بعد وہ سیٹھ کے گھر چلا گیا۔ سیٹھ اور سیٹھانی سکیم کے مطابق اچانک گھر پہنچے اور منشی کو اپنی بیٹی کے ساتھ نازیبا حرکتیں کرتے پکڑ لیا۔ اس میں اس کی بیٹی کی مرضی شامل تھی۔ سیٹھ اور منشی میں ترش کلامی ہوئی۔ سیٹھ نے منشی کو دکان پہ جانے کو کہا اور اُس کے بعد اپنی بیٹی کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ پانچ چھ دنوں بعد سیٹھانی کو پتہ چلا کہ اس مسلمان منشی کو نوکری سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اس سے تین روز بعد بیٹی گھر سے غائب ہو گئی۔

سیٹھانی کو اس کے سوا اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مَیں نے اُس سے منشی کی بہن کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا۔ میری زبان پر اس کے متعلق ایک سوال آچلا تھا لیکن عقل نے میری مدد کی۔ مَیں نے ایک اور ترکیب سوچ لی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سیٹھانی سیٹھ کو بتائے گی کہ مَیں آیا تھا اور اس کی بیٹی کے متعلق معلومات لے گیا ہوں۔ مَیں سیٹھ کو اب ایک اور طریقے سے پھانسنا چاہتا تھا۔ نقب زنی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ لڑکی مسلمان تھی اور ہندوؤں کے قبضے

میں تھی۔ مجھے ابھی کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا تھا کہ یہ لڑکی یعنی مسلمان منشی کی بہن سیٹھ کے قبضے میں ہے، زندہ ہے، ماردی گئی ہے۔ کہیں آگے چلادی گئی ہے۔ میں ایک زبانی شہادت کے تحت اندھیرے میں ہاتھ مار رہا تھا۔

میں نے سیٹھانی کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے اُس کی بیٹی کی حمایت میں باتیں شروع کر دیں۔ اُسے کہا کہ یہ منشی بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اُس نے شریف لڑکی کو ورغلا لیا ہے۔ میں اسے پکڑ کر نقب زنی کے ساتھ اغوا کی سزا بھی دلاؤں گا۔ مجھے صرف یہ پتہ چل جائے کہ وہ ہے کہاں ..... وہ میری باتوں میں پوری طرح جکڑی گئی۔ اندر سے وہ ڈاک کے دو لفافے لے آئی۔ دونوں پھٹے ہوئے تھے۔ ایک میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ مسلمان منشی کا خط تھا۔ سیٹھ کے نام لکھا تھا ــــ "میری بہن کو آزاد کر دو۔ میں تمہاری بیٹی کو چھوڑ دوں گا۔ میری بہن کو میرے گھر پہنچا دو۔ میں صرف چار روز انتظار کروں گا" ــــ نیچے منشی کا نام لکھا تھا۔ جگہ کا نام نہیں تھا جہاں سے خط پوسٹ کیا گیا تھا۔ میں نے لفافے پر ڈاک خانے کی مُہر دیکھی۔ مُہر آگرہ کی تھی۔ دوسرے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ انہیں پہلے خط کے پانچویں روز ملا تھا۔ یہ بھی منشی کا تھا۔ صرف اتنا لکھا تھا ــــ "سیٹھ ہوشیار ہو جاؤ" ــــ اس لفافے پر بھی آگرہ کی مُہر تھی۔ یہ خط ملنے کے چار روز بعد سیٹھ کے گھر نقب لگی۔

سیٹھانی کو میں نے بتایا کہ دونوں خط آگرہ سے آئے ہیں۔ اُس نے کہا "اسے (منشی کو) یہ شک ہے کہ اس کی بہن ہمارے پاس ہے۔ میں نے سیٹھ سے کئی بار کہا ہے کہ اگر اس لڑکی کو آپ نے کہیں چھپا رکھا ہے تو اسے آزاد کر دیں اور اپنی بیٹی کو واپس لیں مگر وہ کہتے ہیں کہ اس کی بہن کے متعلق انہیں کچھ علم نہیں۔ اس بات پر ہماری لڑائی بھی ہو چکی ہے۔"

"کیا آپ کو شک ہے کہ سیٹھ صاحب نے منشی کی بہن کو کہیں قید کر رکھا ہے؟"۔ میں

نے پوچھا۔

"مجھے یہی شک ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "مجھے میری بیٹی واپس چاہیئے۔ مجھے معلوم ہے کہ ڈاکہ اسی مسلمان منشی نے ڈلوایا ہے۔ اگر اُسے اس کی بہن نہ ملی تو یہ آدمی معلوم نہیں اور کیسے طریقے سے انتقام لے گا۔" وہ ہندوؤں کی روایتی بزدلی کے زیرِ اثر خوفزدہ تھی۔

"یہی ڈر مجھے بھی ہے۔" میں نے اسے اور زیادہ ڈرانے کے لیے کہا۔ "اسے اگر میں جلدی پکڑ نہ سکا تو وہ ضرور کوئی اور وار کرے گا۔ کسی کی بہن کو قید کر لو تو وہ قتل کرنے سے بھی نہیں ٹلے گا۔ بہتر یہ ہے کہ منشی کی بہن کو آزاد کر دیا جائے۔"

سیٹھانی اور زیادہ ڈر گئی۔ اُس نے کہا۔ "میرے بچوں پر رحم کریں۔ سیٹھ سے کہیں کہ اگر لڑکی کو اُس نے کہیں چھپا کے رکھا ہوا ہے تو اُسے چھوڑ دے۔ وہ میری نہیں مانتے۔ مجھے ایک شک ہے مگر آپ اُن کے ساتھ بات نہ کرنا ورنہ وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔"

یہ سیدھی سادی عورت تھی اور خوفزدہ بھی تھی۔ میں نے اُس کے خوف میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اُس کے گھر میں نقب بھی لگی تھی۔ جس گھر میں نقب لگے اس گھر والوں کو دیکھیں، وہ خوف سے کئی کئی دن کانپتے رہتے ہیں۔ اس اُکھڑی ہوئی ذہنی حالت میں وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ پولیس انسپکٹر کے ساتھ بات کر رہی ہے۔ دراصل میں نے ہمدردی اور اپنائیت کا مظاہرہ کر کے اس پر اعتماد پیدا کر لیا تھا۔

وہ رو رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ "مہینے ڈیڑھ سے سیٹھ رات دیر تک باہر رہتا ہے۔ شراب تو پہلے بھی پیتا تھا۔ اب زیادہ پیتا ہے۔ اُس نے میرے ساتھ بدسلوکی بھی شروع کر دی ہے۔ یہیں سے مجھے شک ہوتا ہے کہ اُس نے لڑکی کو کہیں رکھا ہوا ہے۔ یہ لڑکی کبھی کبھی میرے گھر آیا کرتی تھی۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وہم

آتے ہیں۔ میری سننے والا کوئی نہیں۔" اور وہ خوفزدہ حالت میں ہی رونے روتی رہی اور اُس نے مجھے کئی بار کہا کہ میں سیٹھ پر اپنا اثر استعمال کروں اور اُسے یہ پتہ نہ چلنے دوں کہ اُس نے میرے ساتھ یہ باتیں کی ہیں۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں سیٹھ کو پتہ نہیں چلنے دوں گا۔ اُسے یہ بھی کہا کہ وہ بھی سیٹھ کو نہ بتائے کہ اُس نے میرے ساتھ منشی کی بہن کے متعلق باتیں کی ہیں۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کے زیورات، آپ کی نقدی اور آپ کی بیٹی واپس لے آؤں گا۔ اگر آپ نے سیٹھ کو یہ باتیں بتادیں جو آپ نے مجھ سے کی ہیں تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

## میرا انتقامی جذبہ

سیٹھانی مطمئن ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس کی ذاتِ باری نے سیٹھانی کی عقل پر جذبات کا پردہ ڈال دیا اور اس کی زبان بے قابو کر دی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ اگر مسلمان لڑکی سیٹھ کے حبسِ بیجا میں سے برآمد ہوئی تو میں اسے گرفتار کر لوں گا۔

میں اسے مزید تسلیاں دے کر وہاں سے تھانے میں چلا گیا۔ قاعدے قانون کے مطابق مجھے نقب زنی کی تفتیش کرنی تھی۔ منشی کی بہن کے اغوا یا حبسِ بیجا کی کسی نے رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ نقب زنی کا مرکزی کردار سیٹھ کا پہلا منشی ہے اور وہ آگرہ میں ہے۔ اس کی تصویر بھی میرے پاس تھی۔ میرے لیے لازم تھا کہ میں منشی کی گرفتاری کا فوری بندوبست کرتا مگر میرے ذہن پہ منشی کی بہن سوار ہو گئی تھی اور میں صاف

طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے اندر انتقامی جذبہ بیدار ہو گیا ہے۔ کانگرسی ہندو لیڈروں نے مجھے دھمکی دے کر للکارا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس مسلمان لڑکی کو برآمد کروں گا اور اس ہندو سیٹھ کو رگڑا دوں گا۔ میں اب خدا سے یہی دُعا مانگ رہا تھا کہ لڑکی برآمد ہو جائے اور اسی سیٹھ کے قبضے سے برآمد ہو۔ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اسی کے قبضے میں ہو گی۔ محض شک تھا۔ سیٹھانی نے میرے شک کو ذرا مضبوط کر دیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ سراغرسانی کا لمبا سفر اختیار کروں یا چالبازی سے کام لوں۔

میں نے ایک چال سوچ لی تھی۔ تھانے میں بیٹھ کر اس پر غور کیا اور اللہ توکّل اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیٹھ میرے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے بلایا۔ وہ غصے کے عالم میں میرے سامنے آیا۔ اُس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "انسپکٹر صاحب! آپ نے اچھی حرکت نہیں کی"۔ میں نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے فروٹ اور لیمن کی بوتلیں لانے کو بھیج دیا۔

"سیٹھ صاحب!" میں نے کہا۔ "جو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت افسوس ہے، اس سے زیادہ افسوس مجھے اس بات پر ہے کہ آپ جیسے پڑھے لکھے اور صاحبِ حیثیت انسان نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں معمولی سا پولیس انسپکٹر ہوں۔ میری ڈیوٹی ایسی ہے کہ شریف لوگوں سے مجھے بعض اوقات غیر شریفانہ سوال پوچھنے پڑتے ہیں۔ یہ میری نوکری اور میری روزی کا معاملہ ہے۔ مجھ سے تو آپ کا منشی اچھا ہے جو شام تک اپنا کام ختم کر کے رات آرام سے سو جاتا ہے۔ میں تو رات سو بھی نہیں سکتا۔ آپ اپنے کیس پر غور کریں۔ یہ میرا فرض ہے کہ آپ کی حلال کی کمائی کے زیورات، نقدی اور کپڑے غائب ہو گئے ہیں، آپ کو ایک ایک پائی واپس دلاؤں۔ پھر مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ کی جوان بیٹی بھی لاپتہ ہے لیکن آپ بدنامی

کے ڈر سے چھپاتے ہیں۔ میں اسے بھی فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی عزت در پردہ واپس دلاؤں۔ حالانکہ آپ چھپا رہے ہیں لیکن میں آپ کی عزت کو اپنی عزت اور آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔"

"لیکن آپ نے مجھ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں نے منشی کی بہن کو اغوا کرایا ہے۔" سیٹھ نے ایسے لہجے میں کہا جس میں رعب کی بجائے دوستی کا رنگ تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے کانگرس کی پوری ورکنگ کمیٹی کے ساتھ مجھ پر یلغار کر دی اور مجھ پر فرقہ پرستی اور ٹال مٹول کا الزام عائد کیا۔ پھر کمشنر اور گورنر کی دھمکی دی۔ آپ نے مجھ پر جھوٹے الزام عائد کیے۔ میں نے آپ پر جھوٹا الزام عائد کر کے جوابی حملہ کیا اور ایس پی کو بلا کر اپنے تحفظ کا بندوبست کیا۔ میں آپ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ آپ کمشنر تک پہنچتے پہنچتے کچھ وقت لگائیں گے لیکن میں یہیں بیٹھے بیٹھے انگریز ایس پی کو یہاں بلا سکتا ہوں.... تو سیٹھ صاحب! میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ جو ہوا سو ہو گیا۔ اگر آپ اپنی بیٹی کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتائیں۔ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

"اور آپ نے ایس پی کے سامنے یہ جو الزام عائد کیا ہے کہ میں نے منشی کی بہن کو اغوا کرایا ہے۔" اس نے کہا۔ "اس کا کیا بنے گا؟ آپ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ پہلے داروغہ نے میرے خلاف کیس رجسٹر نہیں کیا تھا۔"

"ایس پی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔" میں نے کہا۔ "اس نے آپ کو تو ڈانٹ دیا تھا لیکن بعد میں اس نے جو میری بے عزتی کی وہ میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اس نے مجھے کہا کہ اس تھانے میں رہنا چاہتے ہو تو تمیز سے رہو ورنہ لائن حاضر کر کے تمہاری ساری سروس تباہ

کردوں گا۔ ایس پی آپ کو غائبانہ طور پر جانتا ہے۔ اُس نے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ یہ سیٹھ سیاسی لیڈر ہے۔ اُسے آئندہ تھانے نہ بُلانا۔ جب ضرورت پڑے، خود اُس کے پاس جاؤ اور اس کے ساتھ احترام سے بات کرو۔ حکومتِ برطانیہ کسی سیاسی لیڈر کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔"

یقین کریں کہ ہندو سیٹھ میں غبارے کی طرح ہوا بھر گئی۔ اتنا ہوشیار اور چالاک آدمی اپنی جھوٹی تعریف سُن کر اُلّو کا پٹھا بن گیا۔ میں نے کہا۔ "آپ کے سامنے میری کیا حیثیت ہے۔ ایس پی مجھے سختی سے کہہ گیا ہے کہ صرف نقب زنی کی تفتیش کرو۔ کسی لڑکی کے چکر میں نہ پڑو..... سیٹھ صاحب! آپ میرے ساتھ تعاون کریں اور نقب زنی کی تفتیش میں میرا ساتھ دیں۔ میں اب کسی لڑکی کا ذکر تک نہیں کروں گا۔"

میں اب اس کوشش میں تھا کہ وہ سورج غروب ہونے تک میرے پاس بیٹھا رہے۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ فروٹ اور بوتلیں آگئی تھیں۔ میں اسے دوست بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن سے منشی کی بہن کا بوجھ اُتر گیا۔ میں نے عجز و انکساری سے اُسے آسمان پر چڑھا دیا۔

سورج غروب ہو گیا۔ وہ میرا ایسا گرویدہ ہو چکا تھا کہ اُٹھتا ہی نہیں تھا۔ میں اندھیرے کا ہی انتظار کر رہا تھا کیونکہ مجھے اس کا تعاقب کرانا تھا۔ مجھے اپنے تجربے کی بنا پر یقین تھا کہ اگر اُس نے منشی کی بہن کو کہیں چھپا کے رکھا ہوا ہے تو وہاں ضرور جائے گا۔ اُس کی بیوی نے میرے شکوک کی تائید کر دی تھی۔

آخر وہ اُٹھا اور بڑے پیار سے ہاتھ ملا کر بولا۔ "بُرا نہ ماننا۔ میں رشوت پیش نہیں کر رہا۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ اگر آپ کو کسی قسم کی کوئی ضرورت ہو، جتنی رقم

چاہیئے، مجھے بھائی سمجھ کر بتا دینا۔ میں کل کچھ رقم پیش کروں گا۔" ہنس کر کہنے لگا۔ "ہمیں اکٹھے رہنا ہے۔"

"آپ کو اپنی ضرورت نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔" میں نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اگر آپ کو میری ضرورت پڑے تو اپنے نوکر کو بھیج دیجیئے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

## جہاں لڑکی قید تھی

اور وہ چلا گیا۔ میں نے فوراً اپنے مخصوص کانسٹیبل بلائے، انہیں وردی اتار کر سادے کپڑے پہننے کو کہا۔ پھر انہیں ہدایت دی کہ سیٹھ کا تعاقب کریں۔ اگر یہ اپنے گھر چلا جائے تو اِدھر اُدھر ٹہلتے رہیں۔ خواہ ساری رات گزر جائے۔ اس پر نظر رکھیں اور صبح رپورٹ دیں۔

پھر میں نے انہیں کچھ خفیہ ہدایات دے کر روانہ کر دیا۔ ایک اشارہ بھی مقرر کر دیا۔

میں نے چھ کانسٹیبل سادے کپڑوں میں تیار کر لیے۔ سب سے کہا کہ قمیضوں کے نیچے کمر کے گرد ایک ایک ہتھکڑی بمع زنجیر باندھ لیں لیکن ان کی جھنکار نہ ہو۔ اگر ضرورت پڑے تو ہتھکڑیوں کو ہی ہتھیار کے طور پر استعمال کریں۔ میں نے بھی سادے کپڑے پہن لیے اور ریوالور پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ اے۔ ایس۔ آئی کو تھانے میں چھوڑ دیا۔ وہ ہ تھا۔ میری سکیم سے آگاہ تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ میرے جانے کے بعد کسی ہندو کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دے دے گا۔ میں نے ایک مسلمان کانسٹیبل کو الگ لے جا کر کہا کہ وہ اے۔ ایس۔ آئی پر نظر رکھے۔ میں اپنی پارٹی لے کر روانہ ہو گیا۔

میری یہ سکیم ایک جوا تھا۔ خدا نے طبیعت ایسی ڈھیٹ بنائی ہے کہ میں یہ جوا کھیلنے سے ٹل نہ سکا۔ اس کے نتائج میرے خلاف بھی جا سکتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں منشی کی بہن کو سیٹھ کی قید سے برآمد کر لوں تو لڑکی کہہ دے کہ میں اپنی مرضی سے یہاں آئی ہوں اور سیٹھ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ مگر میری جو ایک فالتو حس ہے وہ بتا رہی تھی کہ لڑکی مظلوم ہے اور اس پر زیادتی ہو رہی ہے اور یہ سیٹھ اپنی بیٹی کا انتقام اس لڑکی سے لے رہا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میرا دماغ چل تو نہیں گیا؟ جو کچھ بھی تھا، میں ایک خطرہ مول لینے کے لیے پوری طرح تیار ہو کر تھانے سے نکلا۔

سیٹھ کے تعاقب میں دو کانسٹیبل سادہ کپڑوں میں چلے گئے تھے۔ دونوں کو آپس میں اتنا فاصلہ رکھنا تھا کہ ایک دوسرے کا اشارہ دیکھ سکیں۔ مجھے اپنی پارٹی اس طرح بکھیر کر رکھنی تھی کہ پچھلے کانسٹیبل کا اشارہ دیکھ یا سُن سکیں۔ ہمیں اکٹھے نہیں چلنا تھا۔ میں اپنی پارٹی سے ذرا آگے نکل گیا۔ مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ میں اس شہر میں نیا تھا اس لیے شہر کے لوگ مجھے پہچانتے نہیں تھے۔ رات کا اندھیرا بہت فائدہ دے رہا تھا۔

آگے والے دو کانسٹیبلوں میں سے پچھلے نے مجھے ایک جگہ ہاتھ سے اشارہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ سیٹھ اپنے گھر نہیں جا رہا۔ سیٹھ کہیں بہت آگے تھا۔ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس اشارے کی طرح مجھے آگے سے اشارے ملتے رہے اور میں اپنی پارٹی کو اشارے دیتا گلیوں کے موڑ مڑتا گیا۔ آگے کھیت اور میدان آ گئے۔ معمولی سی قسم کے کچے مکان تھے جو ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ یہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔

مجھے رُکنے کا اشارہ ملا۔ پھر پچھلا کانسٹیبل میرے پاس آ گیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ

سیٹھ ایک مکان کے اندر چلا گیا ہے۔ میں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا پھر میں دروازے کی طرف گیا۔ یہ چھوٹا سا مکان تھا جو بمشکل چار مرلے کا تھا۔ یہاں سیٹھ کا کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کسی کوٹھی میں جانا چاہیئے تھا۔ اتنے غریبانہ مکان میں اس کا کیا کام؟.....ایک آدمی اندر سے نکلا اور اس نے باہر کی زنجیر چڑھا کر تالا لگا دیا۔ اندھیرے میں مجھے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ دروازے کے قریب ٹہلنے لگا۔

میں اس کی طرف چلا تو اس نے پوچھا "کون ہے بھائی؟"

میں اس کے قریب چلا گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "بھائی صاحب پولیس چوکی کو کونسا راستہ جاتا ہے؟" میں اسے ذرا آگے لے گیا۔ اُدھر سے میرا ہیڈ کانسٹیبل آ گیا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اس سے ٹارچ لے لی۔ یہ آدمی مجھے راستہ بتانے لگا تو میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے منہ پر ڈالی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہنس کر کہا۔ "ملک صاحب! یہ تو ہمارا پرانا دوست ہے۔"

یہ آدمی شہر کے اُن بدمعاشوں میں سے تھا جنہیں میں نے تھانے میں بلایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اُس مکان میں کیا ہے؟ یہ تمہارا مکان ہے؟ تالا لگا کر کہاں جا رہے ہو؟" ایک ہی بار اتنے سارے سوالوں سے وہ گھبرا گیا۔ اُس نے ہکلا کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں نے پوچھا۔ "سیٹھ اندر کیا کر رہا ہے؟" میں نے ٹارچ بجھا دی۔

میں نے اندھیرے میں دیکھ لیا کہ اُس نے ہاتھ پیچھے کو ہلایا اور ذرا پرے سے مجھے کچھ گرنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ مجھے اناڑی سمجھتا تھا۔ میں نے ٹارچ جلائے بغیر اور دیکھے بغیر اُسے کہا۔ "چابی اُٹھا لاؤ۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چابی پھینک دی

ہے۔ اس پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ہم دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے بڑی ہی بلند آواز سے کہا۔ "مجھے کیوں پریشان کرتے ہو؟ جاؤ۔ یہاں کچھ نہیں ہے"۔ یہ یقیناً مکان کے اندر والوں کو خبردار کرنے کے لیے چلایا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پوری طاقت سے گھونسا مارا۔ وہ پیچھے کو گرا۔ میں نے اپنی پارٹی کو اشارہ دے دیا اور ٹارچ کی روشنی اِدھر کو کی جدھر اُس نے چابی پھینکی تھی۔ مجھے چابی نظر آ گئی۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اس آدمی کو پکڑ لیا۔ میں چابی اٹھا کر مکان کی طرف دوڑا۔ مکان کی پچھلی طرف دو کانسٹیبل موجود تھے۔ میں نے تالا کھولا اور دروازے کو دھکیل کر بہت تیزی سے اندر چلا گیا۔ کانسٹیبل بھی میرے پیچھے آئے۔ یہ تنگ سا صحن تھا۔ دائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ ذرا سا کھلا۔ اندر لالٹین کی روشنی تھی۔ دروازہ یکایک بند ہوا۔ پیشتر اس کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی جاتی، میں نے دوڑ کر کواڑوں کو دھکا دیا۔ میرے کانسٹیبل بھی ہوشیار تھے۔ وہ میرے ساتھ ہی دروازے میں کود کر داخل ہوئے۔

میں نے ریوالور نکال لیا اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پلنگ پر ایک جوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کے جسم پر صرف قمیض تھی۔ کمرے میں شراب کی بُو تھی۔ تپائی پر شراب کی بوتل اور تین گلاس رکھے تھے اور پلیٹوں میں روسٹ گوشت تھا۔ ایک آدمی دوسرے پلنگ کے نیچے گھس رہا تھا۔ میرے ایک کانسٹیبل نے اُسے پیچھے سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ یہ سیٹھ نہیں تھا۔ لباس سے اُسی کی سطح کا امیر کبیر آدمی لگتا تھا۔

لڑکی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ واقعی خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے اُس سے نام پوچھا۔ اس نے نام بتایا تو پتہ چلا کہ یہ منشی کی بہن ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل اس مکان کے پہرہ دار کو اندر لے آیا جو ہمیں باہر ملا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "وہ سیٹھ کہاں ہے؟"

لڑکی نے اشارے سے بتایا۔ "اُس پلنگ کے نیچے ہے"۔ میں نے فوراً جان لیا کہ لڑکی نے شراب پی رکھی ہے یا اُسے پلائی گئی ہے۔

دو کانسٹیبلوں نے پلنگ کے نیچے سے سیٹھ کو نکال لیا۔ اُس نے بھی صرف قمیض پہن رکھی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پلنگ پر اُس کی پتلون پڑی تھی۔ اُس نے پتلون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پرے کر دیا۔ دونوں سیٹھ کانپ رہے تھے۔

میں نے ان دونوں ہندوؤں کو اور ان کے پہرہ دار کو ہتھکڑیاں لگائیں۔ ایک کانسٹیبل کو تھانے بھیج کر اے۔ ایس۔ آئی کو بلایا اور لڑکی اور سیٹھ کے ڈاکٹری معائنے کا انتظام کیا۔ میں اس انتظام کی تفصیلات نہیں سناؤں گا کیونکہ یہ کہانی ہماری بچیاں بھی پڑھیں گی۔ آخری رپورٹ تو ضلع ہیڈ کوارٹر سے لینی تھی۔ یہ رپورٹ حاصل کرنے کے لیے جو فوری اور ابتدائی کارروائی ہوتی ہے، وہ میں نے لڑکی اور سیٹھ کو سول سرجن کے پاس اُسی وقت لے جا کر کر ڈالی۔

میں نے رات کی گاڑی سے اس کارروائی اور خاص چیز کو ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا۔ اس مکان کو میں نے سر بمہر کر دیا تھا اور دو کانسٹیبلوں کی وہاں ڈیوٹی لگا دی تھی۔ دونوں سیٹھوں اور ان کے پہرہ دار کو میں نے حوالات میں بند کر دیا۔ پہرہ دار کو میں نے حوالات کے دوسرے کمرے میں بند کیا تھا، جو عورتوں کی حوالات تھی۔ اس وقت خالی تھی۔ اسے الگ کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ اُسے میں سلطانی گواہ بنانا چاہتا تھا۔ اب حوالات میں صورتِ حال یہ تھی کہ وہاں پہلے سے ایک ملزم بند تھا جس کے کندھے پر زخم تھا۔ وہ نقب زنی کا ملزم تھا اور جس کے گھر اس نے نقب لگائی تھی وہ بھی اسی حوالات میں بند تھا۔

سیٹھ نے میرے ساتھ بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں حوالات کی سلاخوں کے

ساتھ جا کھڑا ہُوا۔ وہ سلاخوں کے اندر تھا۔ اُس نے میرے ایمان کی بولی دی۔ "دس ہزار روپیہ"۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مَیں اس کیس کو گول کر دوں اور انہیں چھوڑ دوں۔ دوسرے سیٹھ نے کہا "دس ہزار مَیں بھی دُوں گا"۔ میں نے ٹالنے کی کوشش کی تو بولی چڑھنے لگی۔ "بارہ ہزار...... پندرہ ہزار..... بیس..... پچیس ہزار"۔

مَیں نے آخر سیٹھ سے کہا۔ "آپ نے شام کو یہاں سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ کسی بھی قسم کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔ سیٹھ صاحب! مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے یہ پوری کر دیں"۔

"ہاں۔ ہاں"۔ اس نے کہا۔ "بتائیے ابھی پوری کر دوں گا"۔

"مجھے آپ کے اقبالی بیان کی ضرورت ہے"۔ مَیں نے کہا۔

وہ بہت جھنجلایا۔ پھر وہ دھمکیوں پر اُتر آیا۔ مَیں وہاں سے خاموشی سے ہٹ آیا اور دفتر میں بیٹھ کر اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا جو مَیں نے پیدا کر لی تھی۔ میرے ہندو اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے ڈرایا تو نہیں، اتنا ضرور کہا۔ "کسی رپورٹ کے بغیر آپ نے خواہ مخواہ نئی مصیبت مول لے لی ہے۔ یہ لوگ اثر و رسوخ والے ہیں۔ کل ضمانت پر رہا ہو جائیں گے اور ہمیں پریشان کریں گے"۔

مَیں نے اس کی بات سُن لی اور اپنے آپ سے کہا کہ اللہ مالک ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کو کافروں کی ایسی ذلیل قید سے رہائی دلائی ہے۔ خدا میری ضرور مدد کرے گا۔ لڑکی تھانے میں تھی۔ مَیں اس ڈر سے اسے اپنے کوارٹر میں نہیں لے جانا چاہتا تھا کہ میرے سٹاف کے ہندو افراد کوئی اور فتنہ کھڑا کر دیں گے۔ مَیں نے لڑکی کو دفتر میں بٹھا کر پوچھا کہ وہ اس کی قید میں کس طرح پہنچی ہے۔ وہ بہت روئی۔ اُسے زبردستی شراب پلائی گئی تھی

اور شراب اسے ہر رات پلائی جاتی تھی۔ اس کا بیان سُن کر میں نے اُسے دو تین باتیں بتائیں اور اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ میں مسلمان ہُوں اور وہ مجھ پر بھروسہ رکھے۔ قانون کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ پُورے کیے بغیر کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ میں اُس کا بیان قلم بند نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ عدالت میں ان کی اہمیت ہی کوئی نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا شک کیا جاتا ہے۔ شک یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کو پولیس نے اپنی حراست میں رکھ کر اپنی مرضی سے بیان لکھ لیا ہے۔

میں نے لڑکی کو ساتھ لیا۔ اے۔ ایس۔ آئی کو بھی ساتھ لیا اور اسے کہا کہ مجھے مجسٹریٹ کے گھر لے چلے۔ اُس کے گھر گئے تو رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ اُسے جگایا۔ کیس کی نوعیت بتائی اور درخواست کی کہ لڑکی کے بیانات قلم بند کر کے سر بمہر کر لیے جائیں اور قانون کے مطابق لڑکی کو کسی معزز شہری کی تحویل میں دیا جائے۔ مجسٹریٹ ہندو تھا۔ وہ لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہم برآمدے میں بیٹھے رہے۔ دس منٹ بعد مجسٹریٹ ہمارے پاس آیا اور ہمارے قریب بیٹھ کر بولا۔ ”لڑکی بالکل معمولی حیثیت اور مشکوک چال چلن کی ہے۔ آپ شہر کے بہت بڑے دو آدمیوں کے خلاف بیان دلوا رہے ہیں۔ آپ یہ قصّہ یہیں پر ختم نہیں کر سکتے؟“ وہ ہندو وڈیری کر رہا تھا۔

”میں اس قصّے کو ہاتھ میں ہی نہیں لینا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ آج ایس پی صاحب بہادر اچانک تھانے میں آ گئے اور انہوں نے ذاتی طور پر حکم دیا ہے کہ لڑکی برآمد کی جائے اور ملزموں کو اُن کی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر گرفتار کر کے رپورٹ انہیں بھیجی جائے۔“

”اگر آپ مشورہ دیں تو میں لڑکی کے بیان میں تھوڑی سی گڑ بڑ کر دیتا ہوں۔“

مجسٹریٹ نے کہا۔ "آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اتنے معزز آدمیوں کو ایسے کیس میں ملوث کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"اگر آپ لڑکی کو بدچلن اور اس کے ساتھ بدکاری کرنے والوں کو معزز سمجھتے ہیں تو آپ جو چاہیں لکھیں۔" میں نے اسے کہا۔ "لڑکی آپ کے قبضے میں ہے۔ صرف یہ پیش نظر رکھیں کہ عدالت میں میرے بیان بھی ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھیں کہ اس لڑکی کے ساتھ نقب زنی کی ایک واردات منسلک ہے اور یہ بھی نوٹ کر لیں کہ پہلے تھانیدار نے اس لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ رجسٹر نہیں کی تھی۔ ایس پی صاحب کے حکم سے اسے معطل کر دیا گیا ہے اور انکوائری کا حکم مل چکا ہے۔ لڑکی اس انکوائری میں بھی پیش ہو گی۔ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ جو چاہیں لکھیں۔ بیان آپ کے پاس رہیں گے جنہیں آپ لفافے میں سربمہر کر لیں گے۔ میں آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ یہ ایک خطرناک کیس ہے۔ میں تو اس میں گڑبڑ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس لڑکی کا بھائی نقب زنی میں مطلوب ہے اور اس سیٹھ کی لڑکی اس آدمی کے پاس ہے۔"

مجسٹریٹ کچھ گھبرایا۔ سر ہلا کر زیر لب بولا۔ "یہ کوئی گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ "میں نے تو ابھی پوری طرح چارج بھی نہیں لیا تھا کہ یہ گورکھ دھندا میرے گلے میں آ پڑا اور ایس پی صاحب آ دھمکے ورنہ میں کوئی چکر چلا لیتا۔"

میں نے اس ہندو مجسٹریٹ کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ ان ہندو سیٹھوں کو بچانے کے لیے کوئی گڑبڑ ضرور کرے گا۔ بیان لینے اور لکھنے میں ساڑھے تین گھنٹے لگے۔ مجسٹریٹ نے لڑکی کے دستخط کرا کے بیان ایک لفافے میں

بند کیے اور ہمارے سامنے لاکھ سے لفافہ سر بمہر کر کے اپنی صندوقچی میں رکھ لیا۔ مجسٹریٹ کے لیے ہوئے بیانات پولیس کو نہیں دکھائے جاتے۔ مقدمے کے دوران مجسٹریٹ لفافہ عدالت کے حوالے کرتا ہے۔ اب لڑکی کو کسی کی تحویل میں دینا تھا۔ مَیں تو کسی کو جانتا نہیں تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے ایک مسلمان کا نام بتایا۔ اُسے اُسی وقت بُلا لیا گیا۔ یہ شہر کا ایک معزز مسلمان تھا۔ مطلوبہ کاغذی کارروائی کر کے لڑکی اُس کے حوالے کر دی گئی اور اسے بتایا گیا کہ عدالت کی طلبی پر وہ لڑکی کو عدالت میں پیش کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

## لڑکی پر کیا گزری

لڑکی اس کے ساتھ جانے سے ڈر رہی تھی۔ بار بار کہتی تھی کہ مجھے اپنے بھائی کے پاس جانے دو۔ میرے بھائی کو بُلا دو۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا بھائی یہاں نہیں ہے اور اس کا گھر پولیس نے سر بمہر کر رکھا ہے۔ باہر جا کر مَیں نے اُسے تسلی دلاسہ دیا اور بتایا کہ وہ یُوں سمجھے کہ اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی ہے۔ وہ بے چاری اس قدر خوفزدہ تھی کہ بات کم کرتی اور روتی زیادہ تھی۔ اس کی جسمانی حالت تو بہت ہی بُری تھی۔ مَیں نے اس معزز مسلمان کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ لڑکی پر کیا گزری ہے۔ اُسے مَیں نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ ہندو مسلم تصادم ہے۔ مسلمان جذبے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

لڑکی نے مجھے جو بیان دیا تھا وہ مختصراً یُوں ہے کہ اس کا بھائی ہندو سیٹھ کا منشی ہے اور اُس کے گھر آتا جاتا ہے۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا بھائی اس شہر میں نہیں ہے۔ مَیں نے اسے بتایا تھا کہ وہ سیٹھ کے کام سے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ یہ لڑکی کئی بار

سیٹھ کے گھر گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ سیٹھ کی بیٹی اُس کی ہم عمر ہے اور اس کی سہیلی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزرا۔ سیٹھ کے گھر کا نوکر اس لڑکی کے گھر آیا اور کہا کہ لڑکی کا بھائی اُسے سیٹھ کے گھر بلا رہا ہے۔ لڑکی نے برقعہ اوڑھا، گھر کو تالا لگایا اور نوکر کے ساتھ چلی گئی۔ سیٹھ کے گھر کو ایک راستہ شہر کے اندر سے جاتا تھا اور دوسرا راستہ شہر سے باہر باہر جاتا تھا۔ لڑکی کو نوکر شہر کے باہر کی طرف سے لے گیا۔ اس نوکر کو لڑکی بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ کوئی اجنبیت نہیں تھی۔ بے فکر ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

راستے میں نوکر نے لڑکی سے کہا۔ "مجھے ایک کام یاد آگیا ہے۔ اس مکان میں میرا ایک رشتہ دار رہتا ہے۔ اسے ایک پیغام دے آؤں"۔ یہ وہی الگ تھلگ مکان تھا جہاں سے میں نے لڑکی کو برآمد کیا تھا۔ لڑکی رُک گئی اور کہا کہ جاؤ پیغام دے آؤ۔ نوکر نے اُسے کہا۔ "تم یہاں اکیلی کھڑی اچھی نہیں لگتی۔ میرے ساتھ ہی آجاؤ"۔ لڑکی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس مکان کے دروازے پر پہنچ کر نوکر نے لڑکی سے کہا۔ "تم بھی اندر آجاؤ۔ اندر سب عورتیں ہیں"۔ لڑکی اندر چلی گئی۔

نوکر نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کمرے سے دو آدمی نکلے۔ انہوں نے لڑکی کو دبوچ کر اٹھا لیا۔ ایک نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکی پردہ نشین اور شریف تھی۔ بیہوش ہو گئی۔ اس کے بعد اُسے کچھ یاد نہیں کہ وہ دن اور رات میں کتنی کتنی بار بے ہوش ہوئی۔ ہر شام کے بعد یہ ہندو سیٹھ جس کے گھر نقب لگی تھی اس کے پاس آجاتا۔ اُسے فروٹ وغیرہ کھلایا جاتا۔ نہایت اچھا کھانا دیا جاتا۔ اُسے زبردستی شراب پلائی جاتی اور اسے خراب کیا جاتا۔ دن بھر وہ قید رہتی۔ دو مرتبہ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن دو پہرہ دار موجود رہتے تھے۔ انہوں نے دونوں مرتبہ اُسے پکڑ لیا۔

لڑکی نے بتایا کہ پہلے پانچ چھ دن سیٹھ اُسے کہتا رہا کہ ہندو ہو جاؤ اور میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گا۔ وہ نہ مانی۔ اس کافر نے اسے بغیر شادی کے بیوی بنائے رکھا۔ لڑکی نے اس کے پاؤں پکڑے، رو رو کر فریادیں کیں کہ میرے بھائی نے تمہاری بہت خدمت کی ہے۔ اسی کی خاطر مجھے چھوڑ دو۔ ایک بار سیٹھ نے اُسے کہا ـــ "تمہارے بھائی نے میری جو خدمت کی ہے، میں تمہیں اسی کا صلہ دے رہا ہوں" ـــ لڑکی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ سیٹھ کی بیٹی اس کے بھائی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ چند دنوں بعد سیٹھ نے اُسے کہا کہ ہندو مذہب اختیار کر لو، میں تمہیں ایک بڑے خوبصورت ہندو جوان سے بیاہ دُوں گا۔ لڑکی نہ مانی۔ پھر سیٹھ نے ہر شام اپنے ایک دوست کو وہاں مدعو کرنا شروع کر دیا۔

لڑکی نے مجھے اپنی بپتا سناتے ہوئے کہا۔ "شروع میں وہ مجھے زبردستی شراب پلاتے تھے۔ میں نے جب رہائی کی اُمیدیں توڑ دیں تو میں نے شام کو خود ہی شراب پینی شروع کر دی۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ میں اپنے آپ کو بھول جاتی تھی اور یہ احساس پیدا ہو جاتا تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہی بہتر ہے"۔

اُس نے خودکشی کے طریقے بھی سوچے اور اس نے سیٹھ کو قتل کرنے کے طریقے بھی سوچے مگر اسے کوئی ذریعہ نظر نہ آیا۔ کیونکہ وہ شریف اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اس شام جس شام میں نے سیٹھ کو اس کے ایک دوست کے ساتھ موقعہ پر پکڑا، سیٹھ کا دوست سیٹھ سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔ سیٹھ دیر بعد آیا اور اپنے دوست سے کہا "آج جو عیش کرنی ہے کر لو۔ کل چھٹی"۔

دوست نے یعنی دوسرے سیٹھ نے اس سے پوچھا کہ چھٹی کیوں؟ اس نے جواب دیا "گڑبڑ ہو گئی ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں جو باتیں کیں وہ اشاروں

ہیں اور گول مول الفاظ میں کہیں جس سے لڑکی کو یہ شک ہوا، اُسے قتل کر دیا جائے گا یا کسی اور کے حوالے کر دیا جائیگا۔ اللہ نے اُس کی سُن لی اور مجھے اس کی نجات کا سبب بنایا۔ اس نے بتایا کہ میں جب اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ سمجھی کہ میں وہ آدمی ہوں جس کے حوالے اسے سیٹھ کرے گا۔ مگر سیٹھ نے باہر کا دروازہ کھلتے ہی کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولا اور دروازہ بند کر کے پلنگ کے نیچے چلا گیا۔

لڑکی کی یہ داستان سُن کر میری جو جذباتی حالت ہوئی تھی، وہ پاگل پن کی کیفیت تھی۔ تھانیداری میرے سامنے آ جاتی تھی ورنہ میں ایسا بھڑکا کہ دل میں آئی کہ ان دونوں سیٹھوں کو جنہیں میں نے حوالات میں بند کر دیا تھا، اپنے ہاتھوں اس طرح قتل کر دوں کہ کئی دن تڑپتے رہیں اور تڑپ تڑپ کر مریں۔ لڑکی روتی تھی اور بار بار اپنے بھائی کا نام لیتی تھی۔ مجھے اس کے بھائی پر غصہ آ رہا تھا جس کی عشق بازی نے اس کی معصوم بہن کو جہنم میں پھینک دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے گناہوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ نقب زنی کا کیس چوپٹ ہو جائے، میری نوکری چلی جائے، میں ان دونوں کافروں کو جیل بھجوا کر دم لوں گا۔

دوسرے دن ان دونوں کا اور ان کے پہرہ دار کا ریمانڈ لینا تھا۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ تینوں کو مجسٹریٹ کے پاس سات روز کے ریمانڈ کے لیے لے جاؤ۔ اس نے پوچھا "سیٹھوں کو ہتھکڑیاں تو نہیں لگیں گی؟"

"کیوں؟" میں نے پوچھا "وہ اخلاقی جرم کے ملزم ہیں۔ ہتھکڑیاں لگیں گی۔"

"سوچ لیں ملک صاحب!" اس نے کہا۔ "یہ معمولی آدمی نہیں ہیں۔"

میں نے زور دے کر کہا "انہیں ہتھکڑیاں لگیں گی موہن بھائی۔ انہیں ہتھکڑیاں

لگا کر لے جاؤ۔"

دونوں سیٹھوں نے ہتھکڑیاں نہ لگانے کے لیے پانچ پانچ ہزار روپیہ پیش کیا اور کہا کہ اپنا آدمی بھیج کر ابھی رقم منگوا لو۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ وہ ہتھکڑیاں نہیں لگواتے اور رشوت پیش کرتے ہیں۔ میں رات سے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اٹھا۔ حوالات کے دروازے تک گیا۔ دو کانسٹیبل ہتھکڑیاں لیے کھڑے تھے اور سیٹھ باہر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے حوالات کا دروازہ کھلوایا۔ ہتھکڑیوں والے کانسٹیبلوں کو اندر لے گیا۔ سیٹھوں سے کہا۔ "آگے آؤ۔ دونوں ہاتھ آگے کرو۔"

انہوں نے منت سماجت کی۔ میں نے آواز دے کر چار کانسٹیبل بلا لیے۔ انہیں کہا۔ "اگر یہ سیدھے طریقے سے ہتھکڑیاں نہیں پہنتے تو انہیں فرش پر لٹا کر ہتھکڑیاں لگا دو اور گھسیٹ کر کچہری تک لے جاؤ۔" دونوں نے ہاتھ آگے کر دیئے انہیں ہتھکڑیاں لگا کر باہر نکالا گیا۔ میں نے احتیاطاً دو کی بجائے چار کانسٹیبل ساتھ بھیجے تاکہ راستے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

اتنے بڑے آدمیوں کے لیے یہی سزا کم نہیں تھی کہ وہ شہر کے ایک عادی مجرم، چرسی اور جواری کے ساتھ ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے شہر میں سے گزارے جا رہے تھے۔ وہ تھانے میں سے نکل گئے تو میں ٹہلتا ٹہلتا باہر والے پھاٹک میں جا کھڑا ہوا۔ انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ میرے جذبات میں ایسا اُبال آیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ بے گناہ مسلمان لڑکی میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ پوٹھوہاری خون جوش میں آ گیا۔ میں نے اپنی تھانیداری پر لعنت بھیجی۔ اگر میں تھانیدار نہ ہوتا تو ان دونوں کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاتا۔

یہ تو انتقام کا غصہ تھا۔ میں نے اس پر قابو پا کر حقائق پر غور کیا تو محسوس کیا کہ میں نے خطرہ مول لیا ہے۔ وہ خطرہ تین گھنٹے بعد تھانے کے دروازے پر آ گیا۔ اس سے ایک گھنٹہ پیشتر سیٹھ واپس آ چکے تھے۔ اے۔ایس۔آئی نے بتایا کہ راستے میں تماشائیوں کا ہجوم ہو گیا اور یہ جلوس کچہری تک ساتھ گیا۔ ریمانڈ لے کر نکلے تو ہجوم دُگنا ہو گیا تھا۔ لطیفہ یہ ہُوا کہ دونوں سیٹھوں کا نام لے لے کر لوگوں نے زندہ باد اور انگریزی راج مردہ باد کے نعرے لگائے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان دونوں کو انگریزی حکومت نے سیاسی لیڈری کے جُرم میں گرفتار کیا ہے۔ ہندوؤں کا باپُو مہاتما گاندھی گرفتاری اور جیل کا شیدائی تھا اس لیے ہندو اُسے ہیرو سمجھتے تھے۔ ان سیٹھوں کو بھی انہوں نے ہیرو بنا دیا۔

## تصویر نے مدد کی

وہ حوالات میں آئے تو ان کے رنگ زرد ہو چکے تھے اور ان پر خاموشی طاری تھی۔ ایک گھنٹہ بعد ہندوؤں کا ایک جلوس جس کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہی ہو گی تھانے کے سامنے آ کر "اسلام مُردہ باد" کے نعرے لگانے لگا اور "ہمارے لیڈروں کو رہا کرو" کے بھی نعرے لگے۔ "جے ہند" کے بھی نعرے لگے۔ میں پھاٹک کی طرف گیا تو اُدھر سے چار پانچ لیڈر آگے آئے۔ یہ صورتِ حال بگڑ سکتی تھی لیکن میں نے ہوش ٹھکانے رکھے۔ لیڈروں نے آگے آ کر میرے ساتھ توہین آمیز باتیں کیں۔ مجھے مشتعل کرنے کی کوشش کی تا کہ میں تشدد کر دوں لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو تھا۔ ان میں وہ لیڈر بھی تھے جو سیٹھ کے ساتھ میرے پاس پہلے بھی آ چکے تھے۔ میں انہیں اپنے دفتر میں لے گیا اور انہیں پوری تفصیل

سے بتایا کہ ان سیٹھوں کا جرم کیا ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ لڑکی مجسٹریٹ کو اپنے بیان دے چکی ہے۔

میں نے انہیں کہا "اگر آپ لوگ میرے ساتھ یہ جلوس بازی کریں گے تو اپنا اور دونوں سیٹھوں کا کیس خراب کریں گے کیونکہ میں اوپر اطلاع بھیج کر انگریز پولیس افسروں اور ڈپٹی کمشنر کو بلا لوں گا۔ انہیں جب پتہ چلے گا کہ ان کا جرم کیا ہے تو وہ ذاتی دلچسپی لے کر ان دونوں کو زیادہ سے زیادہ سزا دلائیں گے۔ ابھی کیس میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے پاس میرے خلاف لڑنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ میں ان کے خلاف جو گواہ پیش کروں گا آپ انہیں توڑنے کی کوشش کریں اور میرا استغاثہ کمزور کریں۔"

ایک لیڈر زیادہ ہی جوشیلا تھا۔ اس نے جوش میں آکر کہا "ہمیں یہاں مسلمان داروغہ نہیں چاہیئے۔"

"یہ آپ بالائی افسروں سے کہیں کہ مجھے یہاں سے ہٹا دیں۔" میں نے کہا "جب تک مسلمان داروغہ یہاں موجود ہے وہ ان ملزموں کو انتہائی سزا دلانے کی کوشش کرے گا اور بدامنی کو دبانے کے لیے پوری کارروائی کرے گا۔ یہ دونوں اخلاقی ملزم ہیں۔ آپ اپنا جلوس فوراً منتشر کر دیں۔ آپ کے لیے اور ان دونوں کے لیے یہی بہتر ہے۔"

ہندو بڑی چالاک اور لومڑی طرح مکّار قوم ہے۔ وہ مجھے دھمکیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے جلوس سے کیا کہا۔ بہرحال جلوس منتشر ہو گیا۔ رات کو میرے مخبر روزمرہ کی ڈیوٹی دینے آئے تو انہوں نے بتایا کہ شہر میں میرے خلاف بہت شور اٹھ رہا ہے اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مسلمان داروغہ نے نقب زنی کے مجرموں کو بچانے کے لیے سیٹھ کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے احتیاطاً اپنے بالائی افسروں کو بذریعہ ٹیلیفون

اطلاع دے دی۔ وہاں سے مجھے حکم ملا کہ صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ اگر زیادہ گڑبڑ کا خطرہ ہو تو فوراً اطلاع دو اور یہ احتیاط بھی کرو کہ ہندوؤں کے جذبات کو مجروح یا مشتعل نہ کرنا۔

میں نے اُس روز نقب زنی کی تفتیش کی یہ کارروائی کی کہ منشی کی فوٹو جو سیٹھ کی بیٹی بملا کی کشیدہ کاری کی کتاب سے برآمد ہوئی تھی وہ نکالی۔ اس کے پیچھے اس فوٹو گرافر کی دکان کی مہر لگی ہوئی تھی جس سے اس نے تصویر اُتروائی تھی۔ میں نے تصویر اس دکان پر بھیج دی اور کہا کہ اگر اس کا نیگیٹو محفوظ ہو تو آٹھ کاپیاں شام سے پہلے پہلے تیار کر دے۔ شام تک مجھے آٹھ کاپیاں مل گئیں۔ میں نے اگلے روز ہیڈ کوارٹر کو یہ تصویریں بھیج کر استدعا کی کہ یہ ملزم آگرہ میں ہے اور نقب زنی میں مطلوب ہے، آگرہ پولیس سے کہا جائے کہ اسے تلاش کرے۔

اُس دَور میں پولیس کا نظام صحیح معنوں میں کام کرتا تھا۔ دسویں روز مجھے اطلاع ملی کہ ملزم کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اُسے وہیں رہنے دیا جائے، میں اس کے گھر کی تلاشی لے کر یہاں لاؤں گا۔ ان دس دنوں میں سیٹھوں کے ساتھ جو معرکہ ہوا وہ یوں ہوا کہ اُن کے وکیل نے ضمانت کی درخواست دی۔ مجھے طلب کیا گیا۔ ان کے وکیل نے کہا کہ ملزم سیاسی، تجارتی اور معاشرتی حلقوں کے بہت اُونچے لوگ ہیں۔ وہ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ تھانے کی غلیظ حوالات میں بند ہیں جہاں اُن کی حیثیت اور صحت تباہ ہو جائے گی۔ انہیں ایک مسلمان انسپکٹر نے مسلمان ہونے کی وجہ سے بے بنیاد الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ لہٰذا انہیں ضمانت پر رہا کیا جائے۔

میں نے اپنا مؤقف یہ پیش کیا کہ الزام بے بنیاد نہیں ہے۔ لڑکی کے بیان مجسٹریٹ کے رُوبرو قلم بند اور سربمہر ہو چکے ہیں۔ ملزم اثر و رسوخ والے لوگ ہیں اور لڑکی

بے آسرا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ملزم تفتیش میں رکاوٹ ڈالیں گے اور لڑکی کو پریشان کریں گے۔
میں نے یہ بھی کہا کہ ملزم ابھی حوالات میں ہیں لیکن شہریوں نے اُن کے حق میں تین ہزار نفوس کا جلوس نکالا اور تھانے پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے جس کی رپورٹ متعلقہ اتھارٹی کو دے دی گئی ہے۔ اگر ملزم ضمانت پر رہا ہو گئے تو شہر میں نقضِ امن کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ دونوں اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی گرفتاری کو سیاسی مسئلہ بنا دیں گے۔

مجسٹریٹ نے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی۔ ان کے وکیل نے ضلعے میں جا کر سیشن کورٹ میں ضمانت کی درخواست دی۔ وہ بھی میرے دلائل کے سامنے بے اثر رہی اور مسترد کر دی گئی۔ سات روز کا ریمانڈ ختم ہو گیا تو میں نے مزید ریمانڈ نہ لیا کیونکہ مجھے ملزموں کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں جوڈیشنل حوالات (جیل) بھیج دیا گیا۔ وہاں جا کر آٹھویں روز ہائی کورٹ نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا۔

# بملا شکیلہ بن گئی

میں آگرہ گیا۔ مسلمان منشی ایک تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ میں نے فوٹو سے اس کا چہرہ ملایا۔ نام پوچھا۔ ولدیت پوچھی اور یقین کر لیا کہ یہی منشی ہے۔ اس نے وہاں منیاری کی دکان کھول لی تھی۔ وہ اسی دکان سے گرفتار کیا گیا تھا۔ میں نے قانون کے مطابق اس کے گھر کی تلاشی لی۔ سیٹھ کی بیٹی بملا گھر میں تھی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ میں جب وہاں کے تھانیدار کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا اور اُس نے منشی کو ہتھکڑیوں میں

دیکھی تو اس کا رنگ اُڑ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام بملا ہے؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا "اب میرا نام شکیلہ ہے"۔

"مسلمان ہو گئی ہو؟"

"ہاں"

"سیٹھ کی بیٹی ہو؟"

ہاں" اس نے کہا "اب اس (منشی) کی بیوی ہوں"۔

میں نے دونوں سے کہا "میں تمہیں جیسے کہوں ویسے کرو۔ مجھے پریشان کرو گے تو بہت پریشان ہو گے۔ میری مانتے جاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔۔۔ سیٹھ کے گھر سے جتنا مال نکالا ہے وہ خود ہی نکال دو"۔ منشی نے پس و پیش کی۔ لڑکی خاموش ہو گئی۔ میں نے منشی سے کہا۔

"اب تمہاری ہیرا پھیری بیکار ہے۔ تمہارا ایک ساتھی پکڑا گیا ہے۔ ثبوت مل گیا ہے"۔

"کونسا ساتھی؟" منشی نے پوچھا۔

"جس کا کندھا اینٹ کے کونے سے کٹ گیا تھا" میں نے کہا۔ اُس کا نام بتاؤں؟"

"اندر چلیے" منشی نے کہا۔ پھر اس نے بیوی کو اشارے سے بلایا اور کہا "ٹرنک کھول دو"۔

شکیلہ (سابقہ بملا) نے زیورات اور ریشمی کپڑے نکال دیئے۔ زیورات ایک کپڑے میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کے ڈبے یہ لوگ مکان کے باہر پھینک آئے تھے۔ نقدی صرف گیارہ ہزار ملی۔ منشی نے بتایا کہ چھتیس ہزار تھی۔ اس میں سے پندرہ ہزار دکان میں

لگا دی ہے اور باقی عصمت داروں کو دے دی گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ منشی نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ میں نے تلاشی کی مزید کارروائی پوری کی۔ وہاں کے دو شہروں کے برآمدگی پر دستخط لیے اور شکیلہ کو بھی حراست میں لے لیا کیونکہ مال اس کے قبضے سے برآمد ہوا تھا۔ اگر وہ سیٹھ کی بیٹی نہ ہوتی یعنی نقب زدہ گھر کی فرد نہ ہوتی تو اس کی گرفتاری کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے اُسے اعانتِ جرم میں حراست میں لیا تھا۔

ریل گاڑی میں میں نے ایک چھوٹا کمپارٹمنٹ خالی کرا لیا کیونکہ میرے ساتھ ملزم تھے۔ سفر چھ سات گھنٹوں کا تھا۔ میرے ساتھ دو کانسٹیبل تھے۔ دونوں مسلمان تھے۔ گاڑی چلی تو میں نے کانسٹیبلوں کو دوسری سیٹ پر بھیج کر منشی اور شکیلہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ شکیلہ کے آنسو نہ رہے تھے۔ میں نے اُسے تسلی دی اور ان دونوں سے کہا۔۔۔ "پہلے میری بات سن لو تاکہ تمہارا خوف دُور ہو جائے۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔"

منشی واقعی ذہین اور تیز آدمی تھا۔ فوراً بولا۔۔۔ "آپ کو ہمارے ساتھ کیا ہمدردی ہو سکتی ہے؟ آپ سیدھے کہیں کہ اقبالِ جرم کر لو۔ آپ نے مال برآمد کر لیا ہے جو ساتھ جا رہا ہے۔ اب یہ میری مرضی ہے کہ اقبالِ جرم کروں یا نہ کروں۔ آپ اپنا کیس بنائیں۔" وہ چُپ ہو گیا۔ میں ابھی بولا نہیں تھا کہ اس نے سخت غصّے میں کہا۔۔۔ "آپ کو یہ معلوم نہیں کہ سیٹھ نے میری کنواری بہن اغوا کرا دی ہے اور آپ سے پہلے جو دارو غہ تھا اس نے مجھے بے عزت کر کے تھانے سے نکال دیا تھا۔"

"تمہاری بہن کو میں نے برآمد کر لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بیان مجسٹریٹ کے سامنے قلم بند کروا دیئے ہیں۔ سیٹھ کو ایک اور سیٹھ کے ساتھ گرفتار کر لیا ہے۔ ان کے ساتھ ایک اور ملزم پکڑ رکھا ہے۔ وہ سب جیل میں ہیں۔ میں ان کی ضمانت نہیں ہونے دے

رہا۔ پہلے داروغہ کو میں معطل کرا چکا ہوں اور اس کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے اور یہ صرف میری کوشش کا نتیجہ ہے۔" میں نے شکیلہ سے پوچھا۔ "اپنے باپ کے متعلق تمہاری کیسی رائے ہے؟"

"میں کہتی ہوں کہ اُسے پرسوں مرنا ہے تو ابھی مر جائے۔" شکیلہ نے کہا۔ "اُس شریف نے میری ماں کو ہمیشہ پریشان رکھا پھر اس کی بہن کو اغوا کرایا۔"

"آپ کو میری بہن کا سراغ کس طرح ملا تھا؟" منشی نے کہا۔ "میں آپ کی بات پر یقین نہیں کر سکتا اور اس پر تو میں یقین کر ہی نہیں سکتا کہ آپ نے سیٹھ کو گرفتار کر لیا ہے۔"

میں نے اسے اس کی بہن کا نام بتایا۔ دو نشانیاں بتائیں۔ مختصر یہ کہ میں نے اسے منوا لیا کہ اس کی بہن کو میں برآمد کر چکا ہوں۔ ایک تھانیدار کو قطعاً ایسی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے تھی کہ ملزم کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرے لیکن مجھے یہ ضرورت اس لیے پیش آ گئی تھی کہ میں منشی کو اس کی بہن کی خاطر اور اس لڑکی کی خاطر جس نے اس کے لیے اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا تھا، بچانا چاہتا تھا۔ میرے ذہن اور دل پر منشی کی بہن کی بے آبروئی سوار تھی۔ میری ساری توجہ سیٹھ پر لگی ہوئی تھی۔ اسی جذبے کے تحت میں منشی کو ایک راستہ دکھانا چاہتا تھا۔ یہ تو اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں نے اسے نقب زنی کے بعد کی وہ ساری کارروائی سنائی جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ میں نے جب اس کی بہن کا حال سنایا تو منشی اور شکیلہ کے آنسو بہ نکلے۔ میں نے منشی سے کہا کہ مجھے اصل واقعہ پوری تفصیل سے سنا دو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں میں کس طرح بچاؤں گا۔

# بیٹی کا انتقام بہن سے لیا

اس نے جو قصہ سنایا وہ مختصراً اس طرح ہے کہ وہ سیٹھ کا منشی تھا اور اس کے گھر بھی جایا کرتا تھا۔ سیٹھ کے بچے بڑے ہوئے تو وہ شام کے وقت انہیں پڑھانے کے لیے جانے لگا۔ سیٹھ کی لڑکی بملا (شکیلہ) اسے پسند کرنے لگی۔ گھر کے بہت سارے کمرے تھے۔ وہ نظر بچا کر راز و نیاز کی باتیں کر لیتے تھے۔ ان کی محبت پروان چڑھتی رہی اور وہ دن آیا جب سیٹھ اور سیٹھانی نے انہیں موقعہ پر پکڑ لیا۔ منشی کو سیٹھ نے نوکری سے جواب نہ دیا۔ اس کے دل میں انتقام کا ارادہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے منشی سے کہا کہ وہ معافی مانگ لے تو اسے نوکری سے نہیں نکالا جائے گا۔ منشی نے معافی مانگ لی۔

دو دن بعد منشی شام کے وقت اپنے گھر گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے اڑوس پڑوس میں اپنی بہن کو ڈھونڈا۔ وہ کہیں بھی نہ ملی۔ محلے کے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ اس نے سیٹھ کے نوکر کو اس کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ایک عورت نے اسے بتایا کہ اس نے لڑکی کو باہر تالا لگاتے دیکھا تھا اور اس سے پوچھا تھا کہ کہاں جا رہی ہو؟ اس نے بتایا تھا کہ بھائی [illegible] کے گھر جا رہی ہے۔ اس عورت نے ایک ہندو کو باہر کھڑے دیکھا تھا جسے وہ نہیں جانتی تھی۔

منشی سیٹھ کے گھر چلا گیا۔ سیٹھ گھر نہیں تھا۔ اس نے سیٹھانی اور اس کی بیٹی بملا کو بتایا کہ اس کی بہن لاپتہ ہے اور محلے کے لوگوں نے بتایا ہے کہ ان کا نوکر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نوکر سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ منشی نے مجھے بتایا کہ نوکر کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ

بول رہا ہے۔ سیٹھانی چُپ سی ہو گئی۔ بملا نے غصّے میں اپنے باپ کے خلاف دو چار باتیں کیں۔ سیٹھانی پہلے ہی سیٹھ کے بُرے سلوک سے تنگ تھی۔ منشی نے نوکر کو باہر لے جا کر ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ وہ اسے قتل کرا دے گا۔

نوکر ڈر گیا۔ اس نے منشی کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا "میرا تمہاری بہن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بتا دیتا ہوں کہ اسے سیٹھ نے غائب کرایا ہے۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ کس طرح اور کہاں غائب کیا ہے" —— نوکر نے آدھا جھوٹ اور آدھا سچ بول کر اپنی جان چھڑالی۔ منشی نے اندر جا کر سیٹھانی اور بملا کو بتایا کہ نوکر نے کیا انکشاف کیا ہے۔ منشی سیٹھ کے پاس چلا گیا۔ سیٹھ کے سامنے منشی کی کیا حیثیت تھی؟ اس نے منشی سے کہا "اب تم سمجھ جاؤ گے کہ دوسروں کی بیٹیوں کو خراب کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ڈھونڈو اپنی بہن کو۔"

منشی تھانے گیا۔ تھانیدار ہندو تھا۔ اسے رپورٹ دی۔ جب اسے یہ بتایا کہ فلاں سیٹھ نے اس کی بہن غائب کرائی ہے تو تھانیدار نے ٹال مٹول شروع کر دی۔ پھر اسے ڈانٹ دیا۔ آخر یہ کہا کہ تمہاری بہن اپنی مرضی سے گئی ہے۔ جاؤ، پہلے یہ پتہ کرو کہ وہ کہاں ہے پھر آ کے مجھے بتانا۔ منشی نے رپورٹ درج کرانے پر اصرار کیا تو تھانیدار نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا۔ "اسے حوالات میں بند کر دو اور جو مال اس روز برآمد ہُوا تھا وہ اس کے نام جڑ دو"۔ دو کانسٹیبل منشی کو گھسیٹنے لگے اور حوالات کے دروازے کے سامنے جا کھڑا کیا۔ وہاں اسے کہا گیا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے اور پھر کبھی تھانے میں نہ آئے۔

وہ پھر سیٹھ کی دکان پر گیا۔ خاصی گرما گرمی ہوئی جس کے بعد سیٹھ نے اسے نوکری سے الگ کر دیا۔ منشی نے اسے دھمکی دی اور چلا گیا۔ وہ سیٹھ کے گھر گیا۔ اتفاق سے سیٹھانی گھر نہیں

تھی۔ منشی نے بملا کو بتایا کہ اس کے ساتھ تھانے میں کیا سلوک ہوا اور سیٹھ نے اسے کیا کہا ہے اور اسے نوکری سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ بملا بھڑک اُٹھی۔ اس نے منشی سے کہا کہ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس کے باپ نے منشی کی بہن کو انتقاماً اغوا کرایا ہے۔ بملا سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اُس نے منشی سے کہا کہ کل فلاں وقت فلاں جگہ ملے۔

اگلے روز منشی اور بملا کی گھر سے ذرا دُور ملاقات ہوئی۔ بملا نے منشی کو بتایا کہ رات اس نے اور اس کی ماں نے سیٹھ سے کہا کہ منشی کی بہن کو اُس نے اغوا کرایا ہے۔ اسے گھر بھیج دے۔ سیٹھ شراب پیے ہوئے تھا۔ اُس نے سیٹھانی اور بملا کو خوب پیٹا اور نشے میں یہ بھی بتا دیا کہ لڑکی کو اسی نے اغوا کرایا ہے۔ جس میں ہمت ہے وہ مجھ سے لڑکی چھڑا نے آجائے۔ یہ دراصل شراب کا نہیں، دولت اور اثر ورسوخ کا اثر تھا اور یہ بھی کہ لڑکی مسلمان تھی۔ غریب تھی اور وہاں مسلمانوں کی کوئی رسائی اور شنوائی نہیں تھی۔

بملا نے منشی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کو تیار ہے۔ وہ کچھ رقم بھی گھر سے لے آئے گی لیکن اس شہر سے نکلنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ بملا نے منشی کے ساتھ بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس ارادے کے پیچھے منشی کی محبت بھی تھی اور اپنے باپ کے خلاف انتقامی جذبہ بھی۔ اس جذبے کو بملا نے میرے سامنے یوں بیان کیا۔ ”اس کی بہن میری سہیلی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے باپ نے اسے اس لیے اغوا کرایا ہے کہ اُس نے مجھے اس (منشی) کے پاس ایک ہی صوفے پر اس طرح بیٹھے دیکھ لیا تھا کہ میرا بازو اس کے کندھے پر تھا اور اس کا بازو میری کمر کے گرد تھا۔ میرے باپ نے اس کا بدلہ لینے کے اس کی بہن کو اغوا کرایا۔ میں اپنے باپ کے اخلاق سے واقف ہوں۔ اس لڑکی کے کے بعد اس کا گھر میں رویہ اور زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے میری ماں کو پیٹا، مجھے

بیٹیا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے لڑکی کو کہیں رکھا ہُوا ہے اور اس کے ساتھ ہر شام عیش کرتا ہے۔ میں اپنی ماں کی بے عزتی، اپنی بے عزتی اور اپنی سہیلی کی بے عزتی کا انتقام لینے پر اتر آئی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤں گی اور مذہب بھی تبدیل کر دوں گی۔ میں نے بدلہ لینے کا یہی طریقہ اختیار کیا کہ اپنے آپ کو اس آدمی (منشی) کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

## فرار اور نقب زنی

دونوں جوان تھے۔ جذبات نے ان کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ منشی کی آنکھوں میں خون چڑھا ہُوا تھا۔ اگر بملا اس کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام نہ بناتی تو منشی سیٹھ کو قتل کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ بہرحال انہوں نے نتائج کی پروا نہ کی۔

ایک دو دن بعد وہ پھر ملے اور فرار کا پروگرام طے ہو گیا۔ بملا شام کے بعد چوری چھپے گھر سے نکلی اور منشی کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے چادر میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور اس چادر میں اُس نے ساڑھے تین ہزار روپیہ بھی چھپا رکھا تھا۔ یہ رقم وہ اُس رقم میں سے نکال لائی تھی جو بعد میں نقب زنی میں گھر سے نکل گئی تھی۔ سیٹھ کا روپیہ بنک میں جاتا تھا لیکن جنگ عظیم کی وجہ سے وہ بہت سی نقدی گھر میں بھی رکھتا تھا۔ جنگ کے دوران اکثر تاجروں نے بنکوں سے رقمیں نکلوا لی تھیں کیونکہ سب کو یہ ڈر تھا کہ جاپانی ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ ایک افواہ یہ بھی پھیل گئی تھی کہ انگریزوں کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے بنکوں میں لوگوں کا جو روپیہ جمع ہے اس پر انگریز قبضہ کر لیں گے۔ نوٹوں کے انہی بنڈلوں میں سے بملا نے کچھ نوٹ

چرا لے۔ زیادہ اس لیے نہ اُٹھائے کہ گھر والوں کو شک نہ ہو۔

منشی منتظر تھا۔ آگرہ جانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ منشی کا سکول کے زمانے کا ایک ہم جماعت اور دوست آگرہ میں ملازم تھا۔ ان کی دوستانہ خط و کتابت ابھی تھی۔ منشی نے بملا کو دیکھتے ہی گھر کو تالے لگائے۔ ریل گاڑی کا کوئی وقت نہیں تھا۔ زیادہ انتظار مناسب نہیں تھا۔ پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ منشی نے سامان باندھ رکھا تھا۔ بملا کو ساتھ لے کے بس اڈے پر پہنچا اور بس سے شہر سے نکل گئے۔ پچاس میل دور ایک جنکشن ریلوے سٹیشن پر اُترے جہاں سے نصف گھنٹہ بعد انہیں آگرہ کی ریل گاڑی مل گئی۔

اس گاڑی نے انہیں آگرہ پہنچا دیا۔ وہ دوست کے پتے پر اس کے گھر پہنچ گئے۔ دوست نے انہیں پناہ دی۔ اس کا یہ دوست کچہری میں ملازم تھا۔ اس کے اثر و رسوخ سے منشی کو ایک دکان مل گئی جس میں اس نے تقریباً تین ہزار کا مال رکھ لیا۔ پھر بملا ایک مولوی کے سامنے مسلمان ہو کر شکیلہ بن گئی اور اسی مولوی نے چند افراد کو مسجد میں بلا کر منشی اور شکیلہ کا نکاح پڑھا دیا۔ کسی کے مشورے پر مجسٹریٹ سے شکیلہ کے بیان قلمبند کرا لیے گئے کہ وہ بالغ ہے۔ اپنی مرضی سے اس آدمی کے ساتھ آئی ہے اور آزادانہ مرضی سے اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ شادی کی ہے۔

منشی اپنی بہن کو نہیں بھول سکتا تھا۔ بعض اوقات وہ رو بھی پڑتا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں وہ دو بار اپنے شہر میں گیا اور رات کے وقت اپنے گھر کو جا کر دیکھا۔ وہاں بدستور تالہ لگا ہوا تھا۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکتی رہی۔ ایک روز اس نے شکیلہ سے بات کی کہ وہ انتقام لینا چاہتا ہے۔ کئی طریقے زیرِ غور آئے۔ آخر شکیلہ کی یہ تجویز طے پائی کہ سیٹھ کا مال و دولت اڑایا جائے۔ منشی سیٹھ کے گھر کے سارے کمروں سے اچھی طرح واقف تھا۔ ٹرنکوں

کے متعلق اسے شکیلہ نے بتایا کہ کس ٹرنک میں کیا ہے اور مطلوبہ ٹرنک۔ کہاں کہاں رکھے ہیں۔ اس تجویز کے تحت منشی اپنے شہر میں گیا اور اپنے جرائم پیشہ دوستوں کے ہاں پناہ لی۔ اس نے دو آدمی اپنے ساتھ تیار کر لیے جن میں ایک وہ تھا جس کا کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ وہ میری حوالات میں بند تھا۔ وہ نقب زنی کے فن سے واقف تھا۔ اس نے شہر سے چھ میل دور سے ایک ماہر نقب زن بلا لیا۔ واردات کے وقت منشی اُن کیساتھ تھا۔

نقب لگائی گئی۔ منشی ان کے ساتھ اندر گیا اور وہی دو ٹرنک اور ایک اٹیچی کیس اٹھوایا جن کی نشاندہی شکیلہ نے کی تھی۔ وقت رات کے اڑھائی بجے تھا۔ پہلا آدمی جو اندر گیا وہ یہ زخمی ملزم تھا۔ اینٹ کے کونے نے اس کا کندھا چیر دیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور سلاخ مار کر کونہ توڑ دیا۔ یہی وہ کونہ تھا جو میں نے موقعہ واردات سے اٹھایا اور ملزم کو پکڑا تھا۔ ٹرنک اور اٹیچی کیس باہر لا کر انہوں نے نقدی، زیورات اور ریشمی کپڑے اٹیچی کیس میں ڈالے۔ زیورات کے ڈبے پھینک دیئے گئے تھے۔ دونوں ملزموں نے اپنا اپنا حصّہ وصول کیا اور منشی اٹیچی کیس اٹھائے ریلوے سٹیشن پہنچا۔

ریل گاڑی خاصی دیر بعد آئی اور وہ آگرہ روانہ ہو گیا۔ شکیلہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دوسرے دن منشی نے بہت سامان خرید کر دکان میں بھر لیا۔ انہیں ذرہ بھر شک نہ تھا کہ وہ پکڑے جائیں گے۔ منشی نے اپنے دونوں خطوں کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ پہلا خط پوسٹ کرنے کے چند دن بعد وہ رات کے وقت اپنے شہر گیا اور گھر جا کر دیکھا تھا کہ اس کی بہن گھر آئی ہے یا نہیں۔ پھر اس نے دوسرا خط لکھا اور اس کے بعد یہ واردات کی۔ اس نے کہا۔ " اس کے بعد میرا پروگرام یہ تھا کہ سیٹھ کے گھر کو آگ لگاؤں گا اور اس کے بعد سیٹھ کو قتل کرنے کا پروگرام تھا۔"

یہ ظاہر ہے کہ میں نقب زنی کے مجرموں کو بخش نہیں سکتا تھا لیکن میں صرف تھانیدار نہیں مسلمان بھی تھا جسے ہندوؤں نے صرف اس لیے للکارا تھا کہ وہ مسلمان ہے مجھے ایک ہندو لیڈر نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں مسلمان داروغہ نہیں چاہیئے۔ ہندوؤں نے اسلام مردہ باد کا نعرہ بھی لگایا تھا۔ ہندو سیٹھوں نے ایک معصوم لڑکی کو پورا ایک مہینہ عیاشی کا ذریعہ بنائے رکھا تھا۔ مجھے اس کا بھی انتقام لینا تھا۔ مجھے شکیلہ کا تحفظ بھی کرنا تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا ادھر اپنے شرابی، عیاش اور ہندو باپ سے انتقام لینے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک ہندو لڑکی ایک مسلمان لڑکی کی بے عزتی کا انتقام اپنے باپ سے لے سکتی ہے تو میں تو مسلمان ہوں اور مرد ہوں۔ جہنم میں جائے تھانیداری۔

میں نے منشی کو لمبا چوڑا سبق پڑھایا۔ شکیلہ کو بھی بہت سی باتیں سمجھائیں اور انہیں کہا کہ میں انہیں سزا سے بچا لوں گا۔ میرا سبق مختصراً یہ تھا منشی سے میں نے کہا کہ وہ تیسرے ملزم کی نشاندہی نہ کرے۔ یہ خواہش ظاہر کرے کہ میں اقبالِ جرم کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے ساتھی زخمی ملزم سے بھی یہی کہلوائے۔ میں انہیں مجسٹریٹ کے پاس لے جاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ ان کے اقبالی بیان قلمبند کیے جائیں۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مجسٹریٹ ملزموں کو اپنے چیمبر میں بٹھا کر پولیس کو باہر نکال دیتا ہے اور ملزموں سے کہتا ہے کہ وہ اقبالی بیان دیں یا نہ دیں وہ آزاد ہیں۔ اگر ملزم اقبالِ جرم نہ کرنا چاہیں تو انہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جاتا بلکہ جیل کی حوالات میں بھیج دیا جاتا ہے۔

میں نے منشی سے کہا کہ جب وہ مجسٹریٹ کے پاس جائیں تو وہاں کہہ دیں کہ تھانیدار ہم پر بے رحمی سے تشدد کرتا رہا ہے جس سے تنگ آ کر ہم نے کہا ہے کہ ہم اقبالی بیان دینا چاہتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے شکیلہ سے کہا

کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے یہ بیان دے کہ تھانیدار مجھے ڈراتا رہا ہے اور کانسٹیبلوں سے مجھے بے آبرو کرانے کی دھمکیاں دیتا رہا ہے۔ میں فلاں سیٹھ کی بیٹی ہوں۔ آگرہ میں فلاں مجسٹریٹ کے سامنے بیان دے چکی ہوں۔ میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی۔ مسلمان ہوئی اور اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ میرے باپ نے انتقام کے لیے ہمیں گرفتار کرایا ہے۔

میں نے انہیں سات روز کے ریمانڈ پر حوالات میں رکھا۔ پھر مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان کے لیے لے گیا۔ منشی بہت چالاک آدمی تھا۔ اُس نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ وہ جونہی مجسٹریٹ کے سامنے گیا تو ر اکر گرا اور "بے ہوش" ہو گیا۔ دوسرا ملزم سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور شکیلہ نے رونا شروع کر دیا۔ اور یوں مجسٹریٹ کو یہ تاثر دیا کہ پولیس نے انہیں اذیتیں دے دے کر بے حال کر دیا ہے۔ منشی پانچ منٹ بعد "ہوش" میں آگیا۔ مجسٹریٹ انہیں چیمبر میں لے گیا۔ میں کانسٹیبلوں کے ساتھ باہر انتظار کرتا رہا۔

آدھے ہی گھنٹے بعد مجسٹریٹ نے باہر آکر مجھے اطلاع دی "ملزموں کو میں جوڈیشل لاک اَپ (جیل) میں بھیج رہا ہوں۔ اقبالی بیان نہیں ہو رہا۔" مجھے یہی توقع تھی۔ یہ قانونی طریقہ تھا۔ تینوں جیل چلے گئے۔ جیل خانے کی معرفت انہوں نے وکیل کیا۔ اُس نے تینوں کی ضمانت کی درخواستیں دیں۔ میں نے مخالفت نہ کی۔ تینوں ضمانت پر رہا ہو گئے۔

## انصاف کا در کھُلا

میں نے شہادت تیار کرنے میں جو جو اُستادیاں کیں وہ میں آپ کو نہیں سُناتا

چاہتا کیونکہ آپ بور ہوں گے۔ ان تفصیلات کو صرف پولیس والے سمجھ سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے شہادت اس طرح تیار کی جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو کہ میں ملزموں کی مدد کر رہا ہوں یا اناڑی ہوں یا رشوت لی ہے۔ میں نے ایسی خامیاں چھوڑ دیں جو شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھیں۔ منشی وغیرہ کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ کیس کورٹ میں گیا۔ میں نے شہادتیں پیش کیں اور یہ منظر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ سیٹھ گواہی دینے آیا تو اس کی اپنی بیٹی ملزموں کے کٹہرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

بیٹی کی طرف سے وکیل نے سیٹھ پر جرح شروع کی تو وہ اس قدر توہین آمیز اور شرمناک تھی کہ ایک موقعہ پر سیٹھ نے چلاّ کر مجسٹریٹ سے کہا۔ "میں بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا"۔۔۔ لیکن اسے جواب دینے پڑے۔

سیٹھ کی پوزیشن کو میں نے اس طرح کمزور کر دیا کہ رات رات بیٹھ کر مسلمان لڑکی کے اغوا، حبسِ بیجا اور آبرو ریزی کا مقدمہ اُس کے خلاف قائم کیا اور گواہ اکٹھے کر لیے جن میں زیادہ تر گواہ میرے پڑھائے ہوئے تھے۔ سیٹھ کے نوکر کو بھی میں نے گرفتار کر لیا۔ لڑکی کے پڑوس کے تین مسلمان یہ ثابت کرنے کے لیے تیار کر لیے کہ انہوں نے نوکر کو دیکھا تھا کہ لڑکی کے گھر گیا اور اسے ساتھ لے گیا۔ دو گواہ لڑکی کو اُس مکان میں داخل کرنے کے ثبوت کے لیے تیار کیے۔ اور اس طرح بہت سی شہادت اکٹھی کر لی۔ میرے سٹاف کے مسلمان افراد نے ہندو ایس۔ آئی کو پتہ نہ چلنے دیا اور جھوٹے گواہ لانے میں میری بہت مدد کی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ ثابت کر رہی تھی کہ لڑکی جب اس کے پاس لے جائی گئی تو تھوڑی دیر پہلے اس کی آبرو ریزی ہوئی تھی اور آبرو ریزی اس سیٹھ نے کی تھی۔ غرض میرا مقدمہ بڑا ہی مضبوط تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایس پی صاحب کے حکم کے مطابق میں نے پہلے ہندو تھانیدار کے خلاف بھی شہادتیں اکٹھی کریں۔ اس نے منشی کی یہ رپورٹ رجسٹر نہیں کی تھی کہ اس کی بہن لاپتہ ہو گئی ہے۔ منشی وغیرہ کے صفائی کے وکیل نے منشی کی بہن کے اغوا وغیرہ کو سیٹھ کے خلاف نہایت قابلیت سے استعمال کیا۔

شکیلہ نے جب آخر میں بیان دیا تو میں بھی کانپ اُگیا۔ بیٹی نے باپ کو ایسی بے دردی سے ننگا کیا کہ مجسٹریٹ نے بھی قلم منہ میں ڈال لیا۔ اس نے یہ بھی کہا "میرا باپ میری ماں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا تھا۔ اسے خرچ کے لیے کوئی پیسے نہیں دیتا تھا۔ میں اس کی بیٹی ہوں۔ اپنے گھر سے پوری طرح واقف تھی۔ میرا باپ گھر میں کوئی رقم نہیں رکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں اتنی رقم کبھی آئی نہیں جتنی یہ بتاتا ہے کہ چوری ہوتی ہے۔ اسے میری ماں کی بجائے گھر کے نوکر پر بھروسہ تھا۔ وہ اسے گھر کا خرچ دیا کرتا تھا۔ یہی وہ نوکر ہے جس نے میرے خاوند کی بہن دھوکے سے اغوا کر کے اس کے حوالے کی تھی۔ مجھے اپنے خاوند (ملزم) سے محبت ہے یا نہیں، میں گھر سے اپنے باپ کی کوتوت اور ظلم و تشدد سے بھاگی تھی۔"

مجسٹریٹ نے عدالتی جرح کے دوران شکیلہ پر سوال کیا۔ "کیا شادی سے پہلے ملزم کے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات تھے؟"

"جی ہاں۔" شکیلہ نے دلیری سے جواب دیا اور اضافہ کیا۔ "باپ نے ایک بار ہمیں موقعہ پر پکڑ لیا تھا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے اس نے میرے خاوند کی بہن کو اغوا کرایا اور اب انسپکٹر احمد یار خان کو رشوت دے کر ہم دونوں کو آگرہ سے گرفتار کروایا ہے۔"

صفائی کے وکیل نے مجسٹریٹ کے اس سوال اور شکیلہ کے جواب کو نہایت چابکدستی

سے اپنی آخری جرح میں استعمال کیا۔ بہرحال عدالت کے اندر جو کچھ ہُوا وہ اس قدر دلچسپ اور سنسنی خیز تھا کہ مَیں اس کی پوری کتاب لکھ سکتا ہوں۔ مجسٹریٹ اتنا چکرایا کہ اُس نے کیس سیشن جج کے سپرد کر دیا۔ وہاں پھر وہی ہنگامے ہوئے اور آخر سیشن جج نے تینوں ملزموں (منشی، شکیلہ اور زخمی ملزم) کو صاف بری کر دیا۔ فیصلے میں جج نے میرے خلاف بھی ہلکے سے ریمارکس لکھے۔

اس کیس کے ساتھ ساتھ دونوں سیٹھوں کے خلاف منشی کی بہن کا کیس چل رہا تھا۔ اس کیس کی کامیابی کے لیے میں نے بڑی دماغ سوزی کی تھی۔ یہ کیس بھی سیشن کورٹ میں گیا۔ تین ماہ بعد شکیلہ کے باپ کو تین دفعات میں سزائیں سنائی گئیں۔ اغوا، تین سال۔ آبروریزی، پانچ سال۔ حبسِ بیجا، تین سال۔ اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ جج نے لکھا کہ یہ سزائیں ایک دوسری کے بعد شروع ہوں گی۔ عموماً ایسی سزائیں اکٹھی شروع ہوتی ہیں لیکن سیٹھ گیارہ سال کے لیے اندر چلا گیا۔ دوسرا سیٹھ دو سال کے لیے اندر ہُوا۔ پہرہ دار اور نوکر کو دو دو سال سزائے قید دی گئی۔ انہوں نے اپیل کی جو ہائی کورٹ نے مسترد کر دی۔

پہلے ہندو پولیس انسپکٹر کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی۔ مَیں نے اسے بھی پوری طرح کامیاب کیا۔ اس ہندو کو ایس پی کی کوششوں سے نوکری سے ہی برطرف کر دیا گیا۔

منشی اور شکیلہ آگرہ چلے گئے اور اپنی بہن کو بھی ساتھ لے گئے۔

## جرم و سزا کے موضوع پر احمد یار خان کی ہمیشہ زندہ رہنے والی کتابیں